رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

جمادی الاخریٰ ۱۳۷۵ھ

جلد ۴۵ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ ـ لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۵ | جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۷۵ھ - فروری سنہ ۱۹۵۶ء | عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

اسلامی دستور اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم زندگی کی پوری موجودہ تعمیر کو بدلنے چلے ہیں۔ گویا اب تعلیم، معیشت، تجارت، قانون، معاشرت، داخلہ و خارجہ پالیسی اور تمدن کے تمام شعبوں میں ہماری راہ سیکولرازم پر کاربند ہونے والی قوموں اور سلطنتوں سے الگ ہو رہی ہے۔ کہنا چاہیے کہ ہم ایک بڑا انقلابی موڑ مڑ رہے ہیں۔

اس طرح کے انقلابی موڑ سفرِ تاریخ میں جب بھی اقوام کے سامنے آتے ہیں تو حکمراں طاقت کا پارٹ بڑا ہی اہم ہو جاتا ہے، کیونکہ وہی تمدن کی گاڑی کی ڈرائیور اور گارڈ ہوتی ہے۔ یہ طاقت اخلاص کے ساتھ اگر تبدیلی کے ملّی عزم کو پورا کرنے پر تُل جائے تو دستور کا ایک ایک لفظ زندہ حقیقت بن جاتا ہے اور اگر یہی تبدیلی کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو تو دنیا کا بہترین دستور ردّی کے ایک پرزے میں بدل جاتا ہے ــــ یا اگر دستور کے پیچھے مضبوط اور منظم رائے عام موجود ہو تو پھر اس کے ساتھ سازگار نہ ہو سکنے والی قیادت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ طاقت بسم اللہ نہ کرے، اجتماعی پیمانے پر کسی تعمیری و اصلاحی مہم کا آغاز نہیں ہو سکتا۔

عام لوگوں میں امید، اعتماد، حرکت اور سرگرمی کا آغاز اسی دن ہو گا جس دن وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے رہنما اور لیڈر اور ان کے حکمراں اور کارپرداز بدل رہے ہیں۔ ان کو محسوس ہونا چاہیے کہ یہ لوگ جو نیا دستور لائے ہیں وہ محض "ایک کھوکھلی سی کاغذی کارروائی" نہیں ہے، بلکہ اس کے بنانے اور پیش کرنے اور اسے نافذ کرنے والوں کے اندر نیک نیتی کارفرما ہے، نئے جذبات برسرِعمل ہیں، پہلے سے مختلف ذہنیت پیدا ہو چکی ہے اور ایک الگ قسم کا کردار ارتقا کر رہا ہے۔ اب ان لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل گئے ہیں، اور اب ان کے فیصلوں کے معیارات نئی شکل اختیار کر گئے ہیں، اب ان کی پالیسیوں کا رُخ دوسرا ہے، اب انھوں نے بھلائی اور برائی کے دوسرے پیمانے لے لیے ہیں، اب ان کے تعاون اور تصادم کے وجوہ پہلے سے مختلف

ہو گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ لوگوں کو اپنے کارپردازوں کے متعلق یہ تاثر ملنا چاہیے کہ اب یہ لوگ ویسے نہیں رہے جیسے پہلے ہوا کرتے تھے، اب یہ نئی شان سے جلوہ گر ہوئے ہیں اور اب ان کے ساتھ نئے طرز سے معاملہ کرنا چاہیے۔

اگر کسی اہم تاریخی موڑ کے آنے پر حکمران طاقت اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کر کے عوام کو ایسا تاثر دیتی ہے تو لوگوں میں ایک نیا جذبہ اعتماد پیدا ہوتا ہے، ان کی امیدوں میں جان پڑ جاتی ہے، ان میں فداکاری و اطاعت کا میلان زور پکڑتا ہے اور وہ قربانیاں دینے اور کچھ کر دکھانے کی نئی اسپرٹ کے ساتھ متحرک ہو جاتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو پھر محض کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ کا جادو کسی قوم کو نئی زندگی نہیں دے سکتا اور نہ عوام کو مایوسی اور بے اعتمادی کی حالت سے نکال سکتا ہے۔

پس نئے دستور کے نفاذ سے قبل حکمران طاقت کو چاہیے کہ وہ اپنے ذہن اور مزاج اور کردار کو یکسر بدل کر نئے روپ میں قوم کے سامنے آئے۔

حکمرانوں کے بارے میں عوام اب تک جو تصور رکھتے ہیں اس کے برے اثرات ہر پہلو سے نمایاں ہیں۔ جب تک یہی تصور قائم ہے، یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنے لیڈروں سے حقیقی محبت ہو، وہ ان پر دلی اعتماد رکھیں، وہ ان کے اشاروں پر متحرک ہوں، وہ سچے وفادارانہ جذبات سے ان کے احکام کی اطاعت کریں اور ان کے منصوبوں کو عمل میں لانے کے لیے قربانیاں دیں۔ اس تصور کے ہوتے ہوئے تو بس یہی ممکن ہے کہ جہاں تک قانون و اختیار کا ڈنڈا چل سکے وہاں تک کاروان رہبروں کی مرضیات کی تعمیل کرے اور جہاں اس ڈنڈے کی پہنچ نہ ہو یا اس کی مار سے بچنے کے لیے کوئی ڈھال بہم پہنچائی جاسکے وہاں جو جس کا جی چاہے کرتا ہے۔

اب تک ملت اپنے سربراہ کاروں کا تصور یہ رکھتی ہے کہ یہ عام لوگوں سے الگ تھلگ ایک مخلوق ہیں جس کی ایک الگ دنیا ہے۔ یہ لوگ عام لوگوں کے بھائی بند نہیں ہیں بلکہ خصوصی حقوق رکھنے والے دیوتا ہیں۔ یہ گویا سیاسی برہمنوں کا ایک فوق العام طبقہ ہوتا ہے۔ یہ قوم کے خادم نہیں، اس کے آقا و مولا

ہیں۔ ان کا رہن سہن ایک "عالمِ بالا" میں ہوتا ہے۔ ان کی زندگیوں کا مشن اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ عہدوں کے لیے کشمکش میں لگے رہیں اور اس کرسی سے اچھل کر اس کرسی پر اور اس مسند سے چھلانگ لگا کر اس مسند پر آتے جاتے رہیں۔ ہر حال میں ان کو قومی خزانے سے بڑی بڑی تنخواہیں ملنی چاہئیں، جن کے بل پر بڑی بڑی جائدادیں بنائی جاسکیں اور غیر ملکی بنکوں میں آئندہ سات پشتوں کے لیے سرمائے جمع ہو جائیں، رہنے کو اعلیٰ درجہ کی آراستہ کوٹھیاں اور پیر اسنہ بنگلے ہوں، تفریح کے لیے ٹھاٹھ دار بالماحت ہوں، آنے جانے کے لیے اسپیشل ٹرینیں، معیاری بھرم اور نازک خرام کاریں اور صبا رفتار ہوائی جہاز ہوں، شاہانہ جلوس نکلوانے کے لیے کئی کئی گھوڑوں سے کھینچی جانے والی زرق برق بگھیاں ہوں، خدمت کے لیے نوکروں کے پرے ہوں، اٹھنے بیٹھنے کے لیے شاہانہ فرنیچر ہو، ہر ہر ضرورت کے لیے بڑے بڑے الاؤنس ہوں، دعوتوں اور ضیافتوں کے لیے مرعوب کن شاہانہ سامان ہوں، جدھر جائیں "تاریخی استقبال" اور سلامیوں کے انتظامات سرکاری اثر اور دباؤ سے کرائے جائیں، جن راستوں سے ان کا گزر ہو، خدا کی دوسری مخلوق کے لیے ان پر قدغن لگا دی جائے اور ان کی تفریحات کے لیے اسراف کی آخری حدوں کو چھو لیا جائے۔ ان حالات میں دیکھا جائے تو حکومت کے اونچے عہدے بڑی سے بڑی جاگیرداری اور زمینداری اور بڑی سے بڑی تجارت اور کرخنداری سے زیادہ نفع آور ہیں۔ ایسا شاندار کاروبار اور کونسا ہوگا۔ کیسے یہ ممکن ہے کہ کاروبارِ حکمرانی ذاتی مفاد کی چاٹ سے پاک رہ سکے۔

اور عام لوگ حکمرانوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہم سے جو ٹیکس اور مالیہ و آبیانہ اور دوسرے محصولات و واجبات ریاست کے نام سے سرکاری خزانے میں لیے جاتے ہیں، یہ سب انہی کا استعمال ہے۔ پھر جب وہ اپنی بدحالیوں اور پریشانیوں سے گزرتے ہوئے ان مناظر کو دیکھتے ہیں تو ان کے حوصلوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ ان حالات کو جوں کا توں رکھ کر اب اگر اسلام کی بولی بولی جائیگی تو آخر اس بولی کی ساکھ بھی کیا باقی رہے گی۔

ناگزیر ہے کہ ملت کے سربراہ کار اپنے طرزِ عمل کی تبدیلی سے اپنے بارے میں ایک نیا تصور دلائیں۔ وہ قومی خزانے کے لیے ایک نیا رحمدلانہ رویّہ اختیار کریں اور محسوس کرائیں کہ یہ خدمت "کوئی کاروبار نہیں ہے" یہ ذاتی مفاد کا کوئی کھیل نہیں ہے اور اس سے ان کا مقصود اپنے لیے سامانِ عشرت اور اپنے بچوں کے لیے

جائدادیں پیدا کرنا نہیں ہے۔ نیز وہ پہلے اندازِ تکبّر اور شانِ جلالت مآبی کو چھوڑ کر ملک کے شہریوں کو یہ تاثر دلائیں کہ وہ ان کے بھائی ہیں، ان کے ساتھی ہیں، ان کے خادم ہیں —— اس سے زائد کچھ نہیں ہیں۔

عہدے کی کرسی کے متعلق عام لوگوں کا مستقل تصوّر یہ ہے کہ اس پر بیٹھنے والا اپنے لیے، اپنے بچوں اور عزیزوں کے لیے، خاندان اور برادری والوں کے لیے، کشمکشِ اقتدار میں ساتھ دینے والے حامیوں کے لیے جدھر چاہے کامیابی اور ترقی کے دروازے کھول سکتا ہے۔ وہ نوکریاں دلوا اور چھنوا سکتا ہے، وہ ٹھیکے اور کوٹے حاصل کرنے میں مدد بھی دے سکتا ہے، مراعتیں بھی پیدا کر سکتا ہے، وہ مکان، زمین، دکان اور کارخانے کی الاٹ منٹ کرا کے دے بھی سکتا ہے اور پہلے کی الاٹ منٹ کو منسوخ کرا بھی سکتا ہے، وہ مقدمے چلوا بھی سکتا ہے اور چلتے مقدمے کو رکوا بھی سکتا ہے، وہ تھانے میں ایک ٹیلیفون کر کے تفتیشی کارروائی کا رُخ بدلوا سکتا ہے، وہ ضیافتوں اور کلب کی مجلسوں میں کسی عہدہ دار کو دو لفظی اشارہ دے کر بگڑے کام بنوا سکتا ہے اور بنے کام بگاڑ سکتا ہے۔ اور وہ کسی فہرستِ استحقاق کی ترتیب کو توڑ کر مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرا سکتا ہے۔ قانون اس کا بندۂ بے دام، پالیسی اس کے گھر کی لونڈی اور ضابطہ اس کے ہاتھوں کا کھلونا ہوتا ہے۔ عہدے کے تصرفاتِ ظاہری و باطنی کی ان ساری شکلوں کے کرشمے دنیا ہر صبح اور ہر شام اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ سب کے سامنے سفارش کی کنجی سے قفل کھلتے ہیں، اثر و رسوخ جب کسی دروازے پر کھڑے ہو کر کہتا ہے "کھل جا سم سم!" تو فوراً اس کے کواڑ چوپٹ کھل جاتے ہیں، اہلِ جاہ اپنی انگشتِ اختیار کی انگوٹھی کو رگڑتے ہیں تو انتظامی طاقت کا جن اپنی پوری شانِ تصرف کے ساتھ دست بستہ حاضر ہو جاتا ہے۔ یہی رنگ ڈھنگ ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر ہر آدمی کی رال ٹپکتی ہے کہ اسے یا اس کے بال بچوں اور برادری کے لوگوں میں سے کسی نہ کسی کو گورنر، وزیر، ایم ایل اے، سیکرٹری، کمشنر، مجسٹریٹ، سپرنٹنڈنٹ پولیس، انکم ٹیکس آفیسر یا کچھ نہ کچھ اور ہونا چاہیے۔ ہر خاندان اس کا آرزومند ہے کہ کامیابی کے تالے کھولنے والی بڑی یا چھوٹی، ایک نہ ایک کنجی اس کے ہاتھ میں بھی ہونی چاہیے۔

عہدہ و اختیار کے اس طریقِ استعمال نے ایک طرف تو قانون، ضابطے، دفتری نظام اور سرکاری پالیسیوں کا سرے سے احترام ختم کر دیا ہے اور لوگوں کو وفادارانہ جذبات کے ساتھ اطاعت اور تعاون کرنے کے قابل

نہیں چھوڑا، نیز بد دیانتی کا زہر سارے نظم و نسق کی رگوں میں پھیلا دیا ہے، دوسری طرف عام لوگوں میں یہ تصور راسخ کر دیا ہے کہ کارِ حکمرانی اپنی اور اپنے دوستوں عزیزوں کی دنیا بنانے کا ایک کھیل ہے۔ اسی مقصد سے ایک ایک حریصِ اقتدار ہر قسم کی دھاندلی کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہے اور اسی مقصد کے تحت وہ طرح طرح کی سانٹھ گانٹھ کر کے کسی کرسی سے عمر بھر کے لیے چمٹا رہنا چاہتا ہے۔ انتخابات میں قانون، اخلاق اور جمہوریت کی اقدار کی مٹی جس طرح پلید کی جاتی ہے اور پھر ایوانِ اقتدار کے اندر جو دھڑے بندیاں بنتی ٹوٹتی رہتی ہیں وہ بجائے خود اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ ریاست اور قوم اور عوام کا نام لے کر دراصل نفسانیت اپنے کرشمے دکھا رہی ہے۔

یہی نفسانیت اگر سنہرے حروف میں لکھا ہوا اسلامی دستور گلے میں لٹکا کر میدان میں نکلے اور اس بات کی امیدوار ہو کہ اب لوگ اس کا خیر مقدم احترام کے جذبوں سے کریں۔ اور دیدہ و دل فرشِ راہ بنائیں اور اس کے ایک ایک اشارے پر قربانیاں دیں اور اپنی زندگیوں کا نقشہ بدل ڈالیں تو یہ توقع عبث ہوگی۔ ایسی ڈرامائی حرکت سے موجودہ ماحول کے کسی گوشے میں رتی بھر تبدیلی بھی رونما نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی رونما ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں کہ ہمارے حکمران اس نفسانیت کو طلاق دیں اور اخلاص کا نیا رنگ اپنے کردار کے نقشے میں بھر کر پبلک کے سامنے آئیں۔ وہ اسلامی دستور کے دور کا پہلا سورج طلوع ہونے کے ساتھ اگر ایک نیا طرزِ عمل لے کر اٹھیں تو پھر یقیناً پوری قوم جواباً ایک نیا طرزِ عمل پیش کرے گی۔ ان کو یہ تبدیلی پہلے دن ہی سے محسوس کرا دینی چاہیے کہ اب اس ملک کے گورنر جنرل اور وزیرِ اعظم سے لے کر تمام بڑے چھوٹے عہدہ داروں تک کوئی بھی عہدہ و اختیارات کی حفاظت سے اپنے حریفوں کو زک دینے اور اپنے اور اپنے دوستوں عزیزوں کے کام سنوارنے کی خیانت کرنے والا نہیں رہا۔ اب سے پبلک کا کوئی خادم قانون اور ضابطہ اور پالیسی سے بالاتر ہو کر ناجائز تصرفات نہیں کرے گا۔ اسلامی دستور کے پاس ہوتے ہی پہلے لمحے ملت کے کارپردازوں کو یہ نیا تاثر دلانا چاہیے کہ حکومت و اقتدار اپنی دنیا بنانے کا ایک کھیل نہیں ہے، بلکہ یہ ملک و قوم بلکہ ساری انسانیت کی سب سے بڑی، سب سے نازک اور سب سے مشکل خدمت ہے۔

اخلاص مندی کے ساتھ اپنے رویے کی تبدیلی سے یہ تاثر دلا کر دیکھیے کہ اس کا ردعمل کیسا حیرت انگیز ہوتا ہے۔

حکمرانوں کے بارے میں — اکا دکا افراد کے استثنا کے ساتھ سہی — جمہور کا ایک تصور یہ بھی چلا آرہا ہے کہ یہ لوگ دستور کو اسلام کا جو تھوڑا بہت رنگ دے رہے ہیں اس کے پیچھے قلب و نظر کی حقیقی تبدیلی کارفرما نہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ چار و ناچار کیا جا رہا ہے۔ لوگوں کی اس بدگمانی کو تین اسباب نے پیدا کیا اور مسلسل پالا پوسا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر ہر قدم پر کئی کئی بار اسلام کے ایک ایک تقاضے کی مزاحمت کی جاتی رہی ہے۔ اور اس کشمکش میں استدلال، کٹ حجتی اور استہزا کے سارے ہی ہتھیار استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ بات بات پر ملاازم کے طعنے، ہر ہر مرحلے میں مذہب کو گروہی سیاست کے لیے ناجائز طور پر آلۂ کار بنانے کا الزام اور ساتھ ہی دین و سیاست کو الگ کر دینے کے عزم کا اظہار، اور پھر ایک لاینحل ذہنی انتشار کے مظاہرے، ایسی چیزیں ہیں کہ جنھوں نے عام مسلمانوں کو عجیب الجھن اور دگدا میں ڈال دیا ہے۔ لوگوں میں بدگمانی پیدا کرنے کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام کو جاننے سمجھنے، اس سے وفاداری رکھنے، اس پر عملاً کاربند رہنے اور اسے ایک نظام کی حیثیت سے عالمِ واقع میں نصب کرنے کی جدوجہد کرنے والے عناصر کے ساتھ حکمران طاقت کا معاملہ پچھلے چند برس سے نہایت درجہ حریفانہ سخت گیرانہ رہا ہے اور ابھی تک اس پہلو سے اس کی پالیسی میں کوئی بنیادی تغیر نہیں ہوا۔

ان اسباب کو اصل تقویت جس چیز نے پہنچائی ہے وہ ملت کے کارپردازوں کی سوشل سرگرمیاں اور کلچرل دلچسپیاں ہیں، جن سے ان کی خود اپنی زندگی کا ایک خاص مزاج بنتا ہے اور جن سے وہ نقشہ نمایاں ہوتا ہے جس پر وہ اپنی پوری قوم کو لے جانا چاہتے ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ مخلوط مجالس عام ہو رہی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ بیگمات کلچر کے ڈرامے میں کیا پارٹ ادا کر رہی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ شرابیں پی جاتی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ ناچ ہوتے ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ نہایت درجہ سفلہ فیشنوں کے فروغ کے لیے فحش لباسوں کی نمائشیں لگتی ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ نسائیت کی فطرت کو بدلنے کے لیے مینا بازار منعقد ہوتے ہیں،

لوگ دیکھتے ہیں کہ گھٹیا درجے کی گندی موسیقی کی سرپرستی و حوصلہ افزائی ہوتی ہے، لوگ دیکھتے ہیں کہ آرٹ کے خوشنما نام پر کیسی عریانی آموز مصوری اور کیسی نفسانیت افروز بت گری کی ترویج کی جا رہی ہے، لوگ دیکھتے ہیں کہ فحش مناظر سے بھرے فلموں کے افتتاح ہوتے ہیں، لوگ دیکھتے ہیں کہ درسگاہوں تک کے ذریعے ان کی اولادوں کو اسی رنگین کلچر کی تربیت دی جا رہی ہے اور دیہات تک اس کی وبا پھیلانے کے لیے منظم سرگرمیاں شروع ہو چکی ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھنے والے یہ سوچے بغیر بھی نہیں رہتے کہ انہی کی کمائیوں سے نچوڑے ہوئے روپے کے بل پر یہ رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔

اسلام کو آپ کتنا بھی متحرک قرار دیں اور اس کا کتنا ہی بڑا ترقی پسندانہ تصور ذہن میں قائم کریں، اس غیر ملکی کلچر کی کھپت اس کے ڈھانچے میں کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ آپ اجتہاد کا وسیع سے وسیع گیٹ بھی کھول لیں تو بھی، صریح حرام اور مکروہ چیزوں کو حلال نہیں بنایا جا سکتا اور گناہ کو ثواب میں نہیں بدلا جا سکتا۔

اب اگر ایک دستور میں آپ یہ لکھ لائیں کہ ہم مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھالیں گے اور شراب، رقص، قمار اور دوسرے مفاسد کی بندش کر کے ایک صالح ماحول پیدا کریں گے، لیکن اس کے ساتھ خود اپنی زندگی کو ان مفاسد سے جوں کا توں آراستہ کیے ہوئے ہوں تو کروڑوں انسانوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر آپ کیسے باور کرائیں گے کہ یہ آپ کے مخلصانہ عزائم ہیں اور خود آپ ہی سب سے بڑھ کر ان عزائم کے پورا ہونے میں رکاوٹ نہیں بنیں گے۔

کم سے کم وہ چیزیں جو صریحاً حرام ہیں اور جن کے بارے میں ایک نظر میں یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ نمونے کے عظیم ترین انسان ــــ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ــــ کی زندگی کے خاکے میں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں، نہ مدینہ کی نوعیت کی ریاست اور سوسائٹی کا مزاج ان کو اپنے تصور میں جگہ دے سکتا ہے، ان کو اسلامی دستور کا جھنڈا اٹھا کر چلنے سے قبل ہی حکمران حضرات یک قلم ترک کر دیں۔ دوسری طرف اسلام کے وہ اساسی تقاضے جن میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں، ان کو اس طرح نئے جذبہ و ذوق کے ساتھ اختیار کریں جیسے ایک نومسلم اختیار کرتا ہے۔

سالہا سال کے بنے ہوئے ذوق اور عمر بھر کی رچی بسی عادات کے بندھن توڑ کر نئے راستے پر چل کھڑے ہونا آسان کام نہیں، لیکن قوموں کی رہنمائی و قیادت کرنے والوں کی ذمہ داریاں اتنی بڑی ہوتی ہیں کہ ان کی خاطر وہ

بڑی بڑی مشکلوں کو عزمِ صمیم سے حل کر لے جاتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو پاکستان کے ساڑھے سات کروڑ باشندوں کی اجتماعی زندگی کو بدلنے کا درپیش ہے جو اس سے بہت زیادہ بڑا ہے، اور اس بڑے کام کو اگر کرنا ہے تو اس کے مقابلے میں چند افراد کی زندگیوں کا بدلنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ جو شخص اور جو گروہ اپنے آپ کو اس تحول سے گذار لے جائے گا وہ ماتحت کارکنوں اور عام لوگوں کی نگاہ میں ایک نئی قدر و قیمت حاصل کر لیگا۔ اس کے اندر کردار کی ایک نئی قوت اُبھر آئیگی جو اس کے ایک ایک بول میں نیا وزن پیدا کر دیگی۔ وہی نئے دستور کا قافلہ سالار ہوگا۔ وہ پکاریگا تو دنیا لبیک کہے گی، وہ حرکت کریگا تو اس کے ساتھ پورا کارواں متحرک ہوگا، وہ جدھر مڑیگا تاریخ بھی اسی طرف رُخ کریگی۔

قول و عمل کا تضاد ہمیشہ زندگی میں فساد پیدا کرتا ہے، اس سے صلاح کی امید نہیں باندھی جاسکتی۔ انتشار کشمکش کا موجب ہو سکتا ہے، یک جہتی اور تعاون کا وسیلہ نہیں ہو سکتا۔ تضاد مایوسی اور جمود پیدا کرتا ہے، اس کے ذریعے امید اور حرکت نہیں پیدا ہوتی۔

حکمراں جماعت کے بارے میں ایک عام تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ اختلاف اور تنقید کو گوارا کرنے کے لحاظ سے سخت "تنگ نظر" ہوتی ہے۔ جو لوگ "قیادت" کی مسندوں پر جا بیٹھتے ہیں وہ بہرحال کوسِ انا ولا غیری بجانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی آواز بلند ہو تو بس ان کے مداحوں اور قصیدہ خوانوں اور جی حضوریوں کی ہو۔ پورا نقار خانہ ایسی ہی آوازوں سے گونجتا رہے اور اگر کوئی اور بولی بولی جائے تو وہ بس طوطی کی صدا بن کر رہ جانی چاہیے۔ لیکن اگر کسی طوطی کی آواز نقار خانے میں سُنی جانے لگے تو ناگزیر ہے کہ وہ گردن زدنی ٹھہرے۔ کوئی شخصیت اور کوئی جماعت اگر اربابِ اقتدار سے مختلف نظریات اور پروگرام لے کے نمودار ہو تو پہلے ہی دن سے اس کا وجود ان آنکھوں میں کھٹکنے لگتا ہے، اور اگر وہ عوام میں مقبولیت بھی حاصل کر لے تو پھر خطرناک ہو جاتی ہے اور اگر وہ اتنا زور پکڑتی نظر آئی کہ حالات کی رَو کو دیر سویر متاثر کرنے کے قابل ہو جائے گی تو پھر باغی اور غدار ہونے کا سرٹیفکیٹ پالیتی ہے۔ محکمۂ سنسر اپنا ایک مستقل شعبہ اس کام میں لگا دے گا کہ ہر ہر شہر کے ڈاکخانے میں بیٹھا وہ خداوندانِ نعمت سے اختلاف کرنے والوں کی دفتری اور

نجی ڈاک کا خورد بینی تجزیہ کرتا رہے، سی آئی ڈی کی پلٹنیں کی پلٹنیں اس مہم میں لگا دی گئی ہیں کہ وہ ان مشتبہ لوگوں کی نقل و حرکت کو بھیس بدل بدل کر کمین گاہوں سے تاکا کریں، نوٹ کریں کہ وہ کہاں جاکر کس سے ملے، ان کی کونسلوں اور مجالس اور جلسہ ہائے عام میں کیا کارروائیاں ہوئیں اور ان کی کن سرگرمیوں کا پس منظر کیا ہے چنانچہ سرکاری خزانے کے صرف سے ایک ایک فرد کے نام کا فائل کھل جاتا ہے اور آہستہ آہستہ یہ ایک لمبے چوڑے دفتر بے معنی کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اس دفتر کا مصرف بس یہ ہوتا ہے کہ جب اختلاف کرنے والی کسی طاقت کی عوامی مقبولیت کے بڑھنے کا، یا اس کی کسی مہم کے مؤثر اور کامیاب ہو جانے کا، یا انتخابات میں اس کی طرف سے کسی نامطلوب پارٹ کے ادا ہونے کا خطرہ سامنے آجاتا ہے تو اوپر سے اس پر اسرار نظام کو اشارہ ملتا ہے کہ فلاں کے خلاف کچھ مواد نکال کے لاؤ۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ فاسد مواد ان دفاتر میں سے چھان پھٹک کر نکال لیا جاتا ہے اور پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر تو وہ بالکل ہی سرسری اور ہوائی نوعیت کا ہوتا ہے تو کوئی سرکاری ترجمان اٹھتا ہے اور ایک اچھی بھلی جانی بوجھی قابل اعتماد شخصیت اور ملک و قوم سے محبت رکھنے والی جماعت کے بارے میں کوئی سنسنی خیز انکشاف کر دیتا ہے۔ اس انکشاف کو لے کر بعض ماہرین فن اخبار نویس مخالفانہ پروپیگنڈے کا ایک طوفان اٹھا دیتے ہیں جو چند روز تک فضا میں خوب اچھی طرح ہل چل مچائے رکھتا ہے۔ اس سے زیادہ زور پیدا کرنا ہو تو سرکاری ترجمان کے بجائے ملک کے کوئی ذمہ دار عہدہ دار یا کوئی وزیر صاحب خود اپنی زبان سے کسی غیر ملکی ہاتھ اور کسی خفیہ سازش کی خبر قوم کو سنائیں گے۔ اور اگر وہ مواد ایسا ہو کہ کسی استبدادی قانون کی زد پر لایا جاسکے تو پھر اسے قانونی مشیروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور ان سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے کہ قانون کے اسلحہ خانہ کا جائزہ لے کر بتاؤ کہ کونسا کاری تیر ایسا ہو سکتا ہے جو اس معاملے میں حریف کا سینہ چھید جائے۔ اس مقصد کے لیے نت نئے ناوک ہائے ہدف گیر تیار کیے جاتے رہتے ہیں اور اب ہمارے قانونی اسلحہ خانے اس ضرورت کے لیے ہر لحاظ سے مکمل ہیں کہ کسی بھی شخص یا گروہ کے کسی بھی قول یا فعل کو وجہ گرفت بنایا جاسکے۔ افراد کو شکار کرنا ہو تو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۳ موجود ہے، اخبار کو شکنجے میں کسنا ہو تو اسی زریں قانون انضباط کی دفعہ ۱۲ حاضر ہے، اس سے زیادہ مظاہرہ انصاف کرنا ہو تو پھر پریس ایمرجنسی ایکٹ موجود ہے۔ کسی جماعت کے شعبۂ

نشر و اشاعت کا راستہ روکنا ہو تو اس کی دفعہ ۸ اٹری کارگر ہے، ان میں کچھ کوتاہی ہو تو بنگال کرائمز ریگولیشن اور فرنٹیر کرائمز ریگولیشن کے بھرے پُرے ترکش مہیا ہیں، کوئی بھی قانون کارگر نہ ہوتا ہو تو نہ سہی، بار بار مقدمات بنا بنا کر اختلاف کے مجرموں کو پریشان کیا جا سکتا ہے اور ان کی قوتوں اور مال اور وقت کو برباد کرایا جا سکتا ہے مجموعی طور پر سیاسی سرگرمیوں کو معطل کرنا ہو اور سرے سے پبلک کی آواز کو دبانا ہو تو دفعہ ۱۴۴ اٹری مجرب طاقت ہے، جس کے نفاذ کی مدت ختم ہونے پر مسلسل تجدید کرتے چلے جائیے، اس دفعہ کا بہت ہی معصومانہ استعمال یہ ہے کہ اسے مجرد لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کی حد تک عائد کیجیے اور کہیے کہ دیکھیے ہم نے تقریروں اور جلسوں کے حقوق کو ذرا نہیں چھیڑا۔ زیادہ بھرپور مار کرنا ہو تو ۹۲ الف کے دور دورہ کا اعلان کر دیجیے تاکہ اسمبلی کے ایوان پر بھی تالے پڑ جائیں، اور آگے جانا پڑے تو مارشل لا لگا دیجیے۔

عالم یہ ہو گیا ہے کہ اس ملک میں وفاداری ان لوگوں کا اجارہ ٹھہری ہے جو کسی کرسی پر تشریف فرما ہوں اور جو لوگ کرسی پر نہ بیٹھے ہوں بلکہ فرشِ خاکی پر چل پھر رہے ہوں وہ سب کے سب اس صورت میں غدار ہوتے ہیں جبکہ ان کے نظریات، آرا اور لائحہ ہائے عمل حکمران بزرگوں سے اختلاف رکھنے والے ہوں۔ حد یہ کہ کل تک جو جو کوئی کرسی تک رسائی نہ رکھنے کی وجہ سے خود غدار کہلاتا تھا، وہ آج کرسی پاتے ہی وفا کا پتلا بن کر دوسروں پر غداری کا ٹھپہ لگانے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی سیاسی تکفیر کی فتویٰ بازی ہے جو روایتی مفتیوں اور فقیہوں کی شان سے مشغلۂ عام بنی ہوئی ہے۔ اب کوئی نہیں رہا جس پر سیاسی مفتیوں نے ایک نہ ایک بار کفر کا فتویٰ چیپک نہ چھوڑا ہو۔ پہلے پہل صرف کمیونسٹ غدار کہلاتے تھے۔ یا پھر یہ فتویٰ سابق کانگرسیوں پر لگایا جاتا تھا، بعد میں آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں"۔ خاکسار غدار ٹھہرے، خدائی خدمتگار پاکستان دشمن شمار ہوئے، آزاد پاکستان پارٹی والے روس کے ایجنٹ گنے گئے، احراری مخالف ریاست اور غیر امن پسندانہ سرگرمیوں کے ملزم گردانے گئے، تحفظِ ختم نبوت والے قانون شکن اقدامات کے مجرم شمار ہوئے، ناظم الدین اور دولتانہ اور ان کی وزارتیں ملکی مفاد سے بے نیازی کی تصویر قرار بنیں، سابق دستور ساز بہ حیثیت مجموعی سازشوں اور جوڑ توڑ کے کوڑھ کی مریض سمجھی گئی، پھر میاں افتخار الدین سے لے کر میر غلام علی تالپور تک، قیوم خاں سے لے کر سردار عبدالرشید تک اور مولوی فضل الحق صاحب

سے لے کر سہروردی اور بھاشانی تک ایک ایک کر کے ہر نمایاں آدمی کے ماتھے پر غداری کی مہر لگتی رہی۔

اور — جماعت اسلامی ؟ — اس کا نام تو روزِ اول سے غداروں اور ملک دشمنوں میں سرِ فہرست درج ہوا۔ کبھی اسے انڈیا سے روپیہ دلوایا گیا، کبھی روس سے آتے ہوئے روبلوں کے توڑے اس کے حساب میں لکھے گئے اور کبھی امریکہ کے ڈالروں کی تھیلیاں اس کے کھاتے میں درج کی گئیں۔ کبھی سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والے صحافیوں نے جماعت اسلامی کا جوڑ ایران کے فدائیانِ اسلام سے لگایا، کبھی مشرقِ وسطیٰ کے اخوان سے اور کبھی انڈونیشیا کی دارالاسلام پارٹی سے! — جب جس گروہ کے خلاف مغربی طاقتوں نے بدنام کن پروپیگنڈہ کی فضا پیدا کر دی، بس اسی کے ساتھ جماعت اسلامی کا خفیہ رابطہ قائم کر دکھایا گیا۔ بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں نے — پرائیویٹ مجالس ہی نہیں، جلسوں کے پلیٹ فارموں اور قومی پارلیمینٹ کے ایوانوں سے — اس کے بارے میں طرح طرح کے غیر ذمہ دارانہ انکشافات کیے۔ چنانچہ اس درجہ کی "مشتبہ" جماعت کو ہر غیر معمولی ہنگامے کی لپیٹ میں لینے کا دروازہ کھلا رہا اور اس دروازے سے ہر طرح کے حوادث اس پر حملہ آور ہوتے رہے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اگر ہم لوگ اپنے اعزہ و احباب کو خطوط میں نجی امور بھی لکھیں، مکتبے اور اخبار کے دفتر سے کاروباری خط و کتابت بھی کریں اور سرکاری طور پر سرِ عام شائع ہونے والے عام لٹریچر یا اخباروں میں آئی ہوئی کھلی معلومات — جو عموماً تمام اخبارات کے ذریعہ باہر جاتی رہتی ہیں — کسی خبری مراسلے میں لکھ بھیجیں، بلکہ اگر یہاں کی منڈیوں کے نرخ کا ہی کوئی تذکرہ کر بیٹھیں اور یہاں کے کسی جلسۂ عام کی کوئی تصویر جو عام اخباروں میں آ گئی ہو، کہیں روانہ کر دیں تو ہر وقت اندیشہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مہربان کوٹھے پر چڑھ کر دنیا کو ایک غیر ملکی ساز باز کی خبر نہ سنا دیں اور ہمارے خلاف کوئی نہ کوئی سخت گیرانہ اقدام قانون یا استبداد کے دائرے میں نہ کر بیٹھیں۔ سوچیے کہ مولانا مودودی تک کی شخصیت مشکوک ٹھہرا دی گئی ہے — تا بہ دیگراں چہ رسد!

یہ فارمولا کہ جو آپ سے اختلاف کرے وہ لازماً غدار ہے، دوسروں سے بڑھ کر خود آپ کے لیے مضر ثابت ہو رہا ہے اور اس نے خود آپ ہی کی ساکھ کو گرایا ہے۔ لوگوں کا عام تاثر یہی ہے کہ اقتدار کو دوامی جاگیر بنا رکھنے کا ایک رجحان ہے جس کی وجہ سے یہ بزرگ ہر اس طاقت کو غداری کے لقب سے

(باقی ص ۶۹ پر)

تفہیم القرآن

النور

(۵)

اور اے نبی، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں

اس عورتوں کے لیے بھی غضِ بصر کے احکام وہی ہیں جو مردوں کے لیے ہیں، یعنی انہیں قصداً مردوں کو نہ دیکھنا چاہیے، نگاہ پڑ جائے تو ہٹا لینی چاہیے، اور دوسروں کے ستر کو دیکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن مرد کے عورت کو دیکھنے کی بہ نسبت عورت کے مرد کو دیکھنے کے معاملہ میں احکام تھوڑے سے مختلف ہیں۔ ایک طرف حدیث میں ہم کو یہ واقعہ ملتا ہے کہ حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھی تھیں، اتنے میں حضرت ابن ام مکتوم آگئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں بیویوں سے فرمایا احتجبا منہ "ان سے پردہ کرو"۔ بیویوں نے عرض کیا یا رسول اللہ الیس اعمٰی لا یبصرنا ولا یعرفنا "یا رسول اللہ کیا یہ اندھے نہیں ہیں؟ نہ ہمیں دیکھیں گے نہ پہچانیں گے"۔ فرمایا افعمیاوان انتما، الستما تبصرانہ "کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؟ کیا تم انہیں نہیں دیکھتیں؟" حضرت ام سلمہ تصریح کرتی ہیں کہ وذالک بعد ان اُمِرَ بالحجاب "یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب پردے کا حکم آچکا تھا" (احمد، ابوداؤد، ترمذی)۔ اور اس کی تائید مؤطا کی یہ روایت کرتی ہے کہ حضرت عائشہ کے پاس ایک نابینا آیا تو انہوں نے اس سے پردہ کیا۔ کہا گیا کہ آپ اس سے پردہ کیوں کرتی ہیں، یہ تو آپ کو نہیں دیکھ سکتا۔ جواب میں ام المومنین نے فرمایا لکنی انظر الیہ "میں تو اسے دیکھتی ہوں"۔ دوسری طرف ہمیں حضرت عائشہ کی یہ روایت ملتی ہے کہ ۷ھ میں حبشیوں کا وفد مدینہ آیا اور اس نے مسجد نبوی کے احاطے میں ایک تماشا کیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہ کو یہ تماشا دکھایا (بخاری، مسلم، احمد)۔ تیسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فاطمہ بنت قیس کو جب ان کے شوہر نے تین طلاق دے دیں تو سوال پیدا ہوا کہ وہ عدت کہاں گزاریں۔ پہلے حضورؐ نے فرمایا کہ

ام شریک انصاریہ کے ہاں رہو۔ پھر فرمایا "ان کے ہاں میرے صحابہ بہت جاتے رہتے ہیں (کیونکہ وہ ایک بڑی مالدار اور فیاض خاتون تھیں، بکثرت لوگ ان کے ہاں مہمان رہتے اور وہ ان کی ضیافت کرتی تھیں) لہٰذا تم ابن ام مکتوم کے ہاں رہو، وہ اندھے آدمی ہیں، تم ان کے ہاں بے تکلف رہ سکوگی" (مسلم، ابوداؤد)۔ ان روایات کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے مردوں کو دیکھنے کے معاملے میں اتنی سختی نہیں ہے جتنی مردوں کے عورتوں کو دیکھنے کے معاملے میں ہے۔ ایک مجلس میں آمنے سامنے بیٹھ کر دیکھنا ممنوع ہے۔ راستہ چلتے ہوئے یا دُور سے کوئی جائز قسم کا کھیل تماشا دیکھتے ہوئے مردوں پر نگاہ پڑنا ممنوع نہیں ہے۔ اور کوئی حقیقی ضرورت پیش آجائے تو ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی دیکھنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ امام غزالی اور ابن حجر عسقلانی نے بھی روایات سے قریب قریب یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ شوکانی نَیلُ الاوطار میں ابن حجر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "جواز کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے کے معاملے میں ہمیشہ جواز ہی پر عمل رہا ہے۔ مسجدوں میں، بازاروں میں، اور سفروں میں عورتیں تو نقاب منہ پر ڈال کر جاتی تھیں کہ مرد اُن کو نہ دیکھیں، مگر مردوں کو کبھی یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ بھی نقاب اوڑھیں تاکہ عورتیں ان کو نہ دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معاملے میں حکم مختلف ہے" (جلد ۶۔ صفحہ ۱۰۱)۔ تاہم یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ عورتیں اطمینان سے مردوں کو گھوریں اور ان کے حسن سے آنکھیں سینکیں۔

۳۱ یعنی ناجائز شہوت رانی سے بھی پرہیز کریں، اور اپنا ستر دوسروں کے سامنے کھولنے سے بھی۔ اس معاملے میں عورتوں کے لیے بھی وہی احکام ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ لیکن عورت کے ستر کے حدود مردوں سے مختلف ہیں۔ نیز عورت کا ستر مردوں کے لیے الگ ہے اور عورتوں کے لیے الگ۔

مردوں کے لیے عورت کا ستر ہاتھ اور منہ کے سوا اُس کا پورا جسم ہے جسے شوہر کے سوا کسی دوسرے مرد حتیٰ کہ باپ اور بھائی کے سامنے بھی نہ کھلنا چاہیے، اور عورت کو ایسا باریک یا چُست لباس بھی نہ پہننا چاہیے جس سے بدن اندر سے جھلکے یا بدن کی ساخت نمایاں ہو۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ اُن کی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئیں اور وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ حضورؐ نے فوراً منہ پھیر لیا اور فرمایا یا اسماء ان المرأۃ اذا بلغت المحیض لم یصلح لھا ان یُریٰ منھا الا ھذا وھذا واشار الی وجھہ وکفیہ "اسماء، جب عورت بالغ ہو جائے تو جائز نہیں ہے کہ منہ اور ہاتھ کے سوا اُس کے جسم کا کوئی حصہ نظر آئے"۔

اور[۳۳] اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں[۳۴] بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے[۳۵]، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں

(ابو داؤد)۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابن جریر نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ ان کے ہاں ان کے اخیافی بھائی عبداللہ بن الطفیل کی صاحبزادی آئی ہوئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ میری بھتیجی ہے۔ آپ نے فرمایا اذا عرکت المرأۃ لم یحل لہا ان تظہر الا وجہہا والا ما دون ھٰذا وقبض علیٰ ذراع نفسہ وترک بین قبضتہ وبین الکف مثل قبضۃ اخری "جب عورت بالغ ہو جائے تو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ ظاہر کرے اپنے منہ کے سوا اور اپنے ہاتھ کے سوا۔ اور ہاتھ کی حد آپ نے خود اپنی کلائی پر ہاتھ رکھ کر اس طرح بتائی کہ آپ کی مٹھی اور ہتھیلی کے درمیان صرف ایک مٹھی کی جگہ اور باقی تھی"۔ اس معاملے میں صرف اتنی رعایت ہے کہ اپنے محرم رشتہ داروں (مثلاً باپ بھائی وغیرہ) کے سامنے عورت اپنے جسم کا اتنا حصہ کھول سکتی ہے جسے گھر کا کام کاج کرتے ہوئے کھولنے کی ضرورت پیش آتی ہے، جیسے آٹا گوندھتے ہوئے آستینیں اوپر چڑھا لینا، یا گھر کا فرش دھوتے ہوئے پائنچے کچھ اوپر کر لینا۔

اور عورت کے لیے عورت کے ستر کے حدود وہی ہیں جو مرد کے ستر کے ہیں، یعنی ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے سامنے عورت نیم برہنہ رہے۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ ڈھانکنا فرض ہے اور دوسرے حصوں کا ڈھانکنا فرض نہیں ہے۔

۳۳؎ یہ بات نگاہ میں رہے کہ شریعتِ الٰہی عورتوں سے صرف اتنا ہی مطالبہ نہیں کرتی جو مردوں سے اس نے کیا ہے یعنی نظر بچانا اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنا، بلکہ وہ ان سے کچھ اور مطالبے بھی کرتی ہے جو اس نے مردوں سے نہیں کیے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس معاملے میں عورت اور مرد یکساں نہیں ہیں۔

۳۴؎ "بناؤ سنگھار" ہم نے "زینت" کا ترجمہ کیا ہے جس کے لیے دوسرا لفظ آرائش بھی ہے۔ اس کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے: خوشنما کپڑے، زیور، اور سر، منہ، ہاتھ پاؤں وغیرہ کی مختلف آرائشیں جو بالعموم عورتیں دنیا میں کرتی ہیں، جن کے لیے موجودہ زمانے میں MAKE UP کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ بناؤ سنگھار کس کو نہ دکھایا جائے، اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۳۵؎ اس آیت کے مفہوم کو تفسیروں کے مختلف بیانات نے اچھا خاصا مبہم بنا دیا ہے، ورنہ بجائے خود

بات بالکل صاف ہے۔ پہلے فقرے میں ارشاد ہوا ہے کہ لَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ "وہ اپنی آرائش و زیبائش کو ظاہر نہ کریں" اور دوسرے فقرے میں اِلّا بول کر اس حکم نہی سے جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ ہے مَا ظَهَرَ مِنْهَا "جو کچھ اس آرائش و زیبائش میں سے ظاہر ہو، یا ظاہر ہو جائے"۔ اس سے صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کو خود اس کا اظہار اور اس کی نمائش نہ کرنی چاہیے، البتہ جو آپ سے آپ ظاہر ہو جائے (جیسے چادر کا ہوا سے اڑ جانا اور کسی زینت کا کھل جانا) یا جو آپ سے آپ ظاہر ہو (جیسے وہ چادر جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے، کیونکہ بہرحال اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے، اور عورت کے جسم پر ہونے کی وجہ سے بہرحال وہ بھی اپنے اندر ایک کشش رکھتی ہے) اس پر خدا کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ یہی مطلب اس آیت کا حضرت عبداللہ بن مسعود، حسن بصری، ابن سیرین اور ابراہیم نخعی نے بیان کیا ہے۔ اس کے برعکس بعض مفسرین نے مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا مطلب لیا ہے مَا يَظْهَرُهُ الانسان علی العادۃ الجاریۃ (جسے عادۃً انسان ظاہر کرتا ہے)، اور پھر وہ اس میں منہ اور ہاتھوں کو ان کی تمام آرائشوں سمیت شامل کر دیتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ جائز ہے کہ عورت اپنے منہ کو مسی اور سرمے اور سرخی پاؤڈر سے، اور اپنے ہاتھوں کو انگوٹھی چھلے اور چوڑیوں اور کنگن وغیرہ سے آراستہ رکھ کر لوگوں کے سامنے کھولے پھرے۔ یہ مطلب ابن عباس اور ان کے شاگردوں سے مروی ہے اور فقہائے حنفیہ کے ایک اچھے خاصے گروہ نے اسے قبول کیا ہے (احکام القرآن جصاص، جلد ۳، صفحہ ۳۸۸ - ۳۸۹)۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ مَا ظَهَرَ کے معنی مَا يُظْهِرُ عربی زبان کے کس قاعدے سے ہو سکتے ہیں۔ "ظاہر ہونے" اور "ظاہر کرنے" میں کھلا ہوا فرق ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن صریح طور پر "ظاہر کرنے" سے روک کر "ظاہر ہونے" کے معاملے میں رخصت دے رہا ہے۔ اس رخصت کو "ظاہر کرنے" کی حد تک وسیع کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور ان روایات کے بھی خلاف جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں حکم حجاب آ جانے کے بعد عورتیں کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں اور حکم حجاب میں منہ کا پردہ شامل تھا، اور احرام کے سوا دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جز بنا دیا گیا تھا۔ پھر اس سے بھی زیادہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ اس رخصت کے حق میں دلیل کے طور پر یہ بات پیش کی جاتی ہے کہ منہ اور ہاتھ عورت کے ستر میں داخل نہیں ہیں۔ حالانکہ ستر اور حجاب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ستر تو وہ چیز ہے جسے محرم مردوں کے سامنے کھولنا بھی ناجائز ہے۔ رہا حجاب، تو وہ ستر سے زائد

کے آنچل ڈالے رہیں[۳۶] وہ اپنا بناؤ سنگھار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے[۳۷] : شوہر، باپ، شوہروں

ایک چیز ہے جسے عورتوں اور غیر محرم مردوں کے درمیان حائل کیا گیا ہے، اور یہاں بحث ستر کی نہیں بلکہ احکام حجاب کی ہے۔

[۳۶] زمانہ جاہلیت میں عورتیں سروں پر ایک طرح کے کساوے سے باندھے رکھتی تھیں جن کی گرہ جوڑے کی طرح پیچھے چوٹی پر لگائی جاتی تھی۔ سامنے گریبان کا ایک حصہ کھلا رہتا تھا جس سے گلا اور سینے کا بالائی حصہ صاف نمایاں ہوتا تھا۔ چھاتیوں پر قمیص کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ اور پیچھے دو دو تین تین چوٹیاں لہراتی رہتی تھیں (تفسیر کشاف جلد ۲ صفحہ ۹۰۔ ابن کثیر جلد ۳، صفحہ ۲۸۴-۲۸۳)۔ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمان عورتوں میں دوپٹہ رائج کیا گیا جس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آج کل کی صاحبزادیوں کی طرح بس اسے بل دے کر گلے کا ہار بنا لیا جائے، بلکہ یہ تھا کہ اسے اوڑھ کر سر، کمر، سینہ سب اچھی طرح ڈھانک لیے جائیں۔ اہل ایمان خواتین نے قرآن کا یہ حکم سنتے ہی فوراً جس طرح اس کی تعمیل کی اس کی تعریف کرتے ہوئے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ جب سورۂ نور نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سن کر لوگ اپنے گھروں کی طرف پلٹے اور جا کر انہوں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں کو اس کی آیات سنائیں۔ انصار کی عورتوں میں سے کوئی عورت ایسی نہ تھی جو آیت وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ کے الفاظ سن کر اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی ہو۔ ہر ایک اٹھی اور کسی نے اپنا کمر پٹہ کھول کر اور کسی نے چادر اٹھا کر فوراً اس کا دوپٹہ بنایا اور اوڑھ لیا۔ دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت جتنی عورتیں مسجد نبوی میں حاضر ہوئیں سب دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں۔ اسی سلسلے کی ایک اور روایت میں حضرت عائشہ مزید تفصیل یہ بتاتی ہیں کہ عورتوں نے باریک کپڑے چھوڑ کر اپنے موٹے موٹے کپڑے چھانٹے اور ان کے دوپٹے بنائے (ابن کثیر ج ۳، ص ۲۸۴۔ ابو داؤد، کتاب اللباس)۔

یہ بات کہ دوپٹہ باریک کپڑے کا نہ ہونا چاہیے، ان احکام کے مزاج اور مقصد پر غور کرنے سے خود ہی آدمی کی سمجھ میں آ جاتی ہے، چنانچہ انصار کی خواتین نے حکم سنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس کا منشا کس طرح کے کپڑے کا دوپٹہ بنانے سے پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو بھی صرف لوگوں کے فہم پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ خود اس کی تصریح فرما دی۔ دِحیہ کلبی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مصر کی بنی ہوئی باریک ململ (قباطی) آئی۔ آپ نے اس میں سے ایک ٹکڑا مجھے دیا اور فرمایا ایک حصہ پھاڑ کر اپنا کرتا بنا لو اور ایک حصہ اپنی بیوی کو دوپٹہ بنانے کے لیے دے دو، مگر ان سے کہہ دینا کہ تَجْعَلُ تَحْتَهُ ثَوْبًا لَا يَصِفُهَا "اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لیں تاکہ جسم کی

کے باپ[۳۸]، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے[۳۹]، بھائی[۴۰]، بھائیوں کے بیٹے[۴۱]، بہنوں کے بیٹے[۴۲]، اپنے میل جول کی عورتیں[۴۳]،

ساخت اندر سے نہ جھلکے" (ابوداؤد، کتاب اللباس)۔

۳۷؎ یعنی جس حلقے میں ایک عورت اپنی پوری زینت کے ساتھ آزادی سے رہ سکتی ہے وہ ان لوگوں پر مشتمل ہے۔ اِس حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہیں، خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا اجنبی، بہرحال ایک عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان کے سامنے زیب و زینت کے ساتھ آئے۔ ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا کے فقرے میں جو حکم دیا گیا تھا اس کا مطلب یہاں کھول دیا گیا ہے کہ اس محدود حلقے سے باہر جو لوگ بھی ہوں، ان کے سامنے ایک عورت کو اپنی آرائش قصداً یا بے پروائی کے ساتھ خود نہ ظاہر کرنی چاہیے، البتہ جو ان کی کوشش کے باوجود یا ان کے ارادے کے بغیر ظاہر ہو جائے، یا جس کا چھپانا ممکن نہ ہو وہ اللہ کے ہاں معاف ہے۔

۳۸؎ اصل میں لفظ آباء استعمال ہوا ہے جس کے مفہوم میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا پردادا، اور نانا پرنانا بھی شامل ہیں۔ لہٰذا ایک عورت اپنی ددھیال اور ننھیال، اور اپنے شوہر کی ددھیال اور ننھیال کے ان سب بزرگوں کے سامنے اُسی طرح آسکتی ہے جس طرح اپنے والد اور خسر کے سامنے آسکتی ہے۔

۳۹؎ بیٹوں میں پوتے پرپوتے اور نواسے پرنواسے سب شامل ہیں۔ اور اس معاملے میں سگے سوتیلے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اپنے سوتیلے بچوں کی اولاد کے سامنے عورت اسی طرح آزادی کے ساتھ اظہار زینت کر سکتی ہے جس طرح خود اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے سامنے کر سکتی ہے۔

۴۰؎ "بھائیوں" میں سگے اور سوتیلے اور ماں جائے بھائی سب شامل ہیں۔

۴۱؎ بھائی بہنوں کے بیٹوں سے مراد تینوں قسم کے بھائی بہنوں کی اولاد ہے، یعنی ان کے پوتے پرپوتے اور نواسے پرنواسے سب اس میں شامل ہیں۔

۴۲؎ یہاں چونکہ رشتہ داروں کا حلقہ ختم ہو رہا ہے۔ اور آگے غیر رشتہ دار لوگوں کا ذکر ہے، اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے تین مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیجیے، کیونکہ ان کو نہ سمجھنے سے متعدد الجھنیں واقع ہوتی ہیں:

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اظہار زینت کی آزادی کو صرف اُن رشتہ داروں تک محدود سمجھتے ہیں جن کا نام یہاں لیا گیا ہے، باقی سب لوگوں کو حتیٰ کہ سگے چچا اور سگے ماموں تک کو اُن رشتہ داروں میں شمار کرتے ہیں جن سے پردہ کیا

جانا چاہیے، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان کا نام قرآن میں نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ سگے چچا اور ماموں تو درکنار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو رضاعی چچا اور ماموں سے بھی پردہ کرنے کی حضرت عائشہ کو اجازت نہ دی۔ صحاح ستہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ کی اپنی روایت ہے کہ ابو القُعَیس کے بھائی اَفلَح ان کے ہاں آئے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ چونکہ پردے کا حکم آچکا تھا اس لیے حضرت عائشہ نے اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ تم تو میری بھتیجی ہو، کیونکہ میرے بھائی ابو القُعَیس کی بیوی کا تم نے دودھ پیا ہے۔ لیکن حضرت عائشہ کو اس میں تامل تھا کہ یہ رشتہ بھی ایسا ہے جس میں پردہ اٹھا دینا جائز ہو۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ نے فرمایا کہ وہ تمہارے پاس آسکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس آیت کو اس معنی میں نہیں لیا ہے کہ اس میں جن جن رشتہ داروں کا ذکر آیا ہے اُن سے پردہ نہ ہو اور باقی سب سے ہو، بلکہ آپ نے اس سے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ جن جن رشتہ داروں سے ایک عورت کا نکاح حرام ہے وہ سب اِسی آیت کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً چچا، ماموں، داماد، اور رضاعی رشتہ دار۔ تابعین میں سے حضرت حسن بصری نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے، اور اسی کی تائید علامہ ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں فرمائی ہے (ج ۳۔ ص ۳۹۰)۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جن رشتہ داروں سے ابدی حرمت کا رشتہ نہ ہو (یعنی جن سے ایک کنواری یا بیوہ عورت کا نکاح جائز ہو) وہ نہ تو محرم رشتہ داروں کے حکم میں ہیں کہ عورتیں بے تکلف ان کے سامنے اپنی زینت کے ساتھ آئیں اور نہ بالکل اجنبیوں کے حکم میں کہ عورتیں ان سے ویسا ہی مکمل پردہ کریں جیسا غیروں سے کیا جاتا ہے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ٹھیک ٹھیک کیا رویہ ہونا چاہیے، یہ شریعت میں متعین نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا تعین ہو نہیں سکتا۔ اس کے حدود مختلف رشتہ داروں کے معاملے میں اُن کے رشتے، ان کی عمر، عورت کی عمر، خاندانی تعلقات و روابط اور فریقین کے حالات (مثلاً مکان کا مشترک ہونا یا الگ الگ مکانوں میں رہنا) کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہونگے اور رہنے چاہئیں۔ اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرزِ عمل جو کچھ تھا اس سے ہم کو یہی رہنمائی ملتی ہے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں آپ کے سامنے ہوتی تھیں، اور آخر وقت تک آپ کے اور ان کے درمیان کم از کم چہرے اور ہاتھوں کی حد تک کوئی پردہ نہ تھا۔ حجۃ الوداع نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف چند مہینے پہلے کا واقعہ ہے اور اس وقت بھی یہی

حالت قائم تھی (ملاحظہ ہو ابوداؤد، کتاب الحج، باب المحرم یؤدب غلامہ)۔ اسی طرح حضرت ام ہانی، جو ابو طالب کی صاحبزادی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن تھیں، آخر وقت تک حضور کے سامنے ہوتی رہیں، اور کم از کم منہ اور چہرے کا پردہ انہوں نے آپ سے کبھی نہیں کیا۔ فتح مکہ کے موقع کا ایک واقعہ وہ خود بیان کرتی ہیں جس سے اس کا ثبوت ملتا ہے (ملاحظہ ہو ابوداؤد، کتاب الصوم، باب فی النیۃ فی الصوم والرخصۃ فیہ)۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عباس اپنے بیٹے فضل کو، اور ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچازاد بھائی) اپنے بیٹے عبد المطلب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں یہ کہہ کر بھیجتے ہیں کہ اب تم لوگ جوان ہو گئے ہو، تمہیں جب تک روزگار نہ ملے تمہاری شادیاں نہیں ہو سکتیں، لہٰذا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر نوکری کی درخواست کرو۔ یہ دونوں حضرت زینب کے مکان پر حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ حضرت زینب فضل کی حقیقی پھوپھی زاد بہن ہیں۔ اور عبد المطلب بن ربیعہ کے والد سے بھی اُن کا وہی رشتہ ہے جو فضل سے ہے۔ لیکن وہ ان دونوں کے سامنے نہیں ہوتیں اور حضور کی موجودگی میں ان کے ساتھ پردے کے پیچھے سے بات کرتی ہیں (ابوداؤد، کتاب الخراج)۔ ان دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر دیکھا جائے تو مسئلے کی صورت وہی کچھ سمجھ میں آتی ہے جو اوپر ہم بیان کر آئے ہیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جہاں رشتے میں شبہ پڑ جائے وہاں محرم رشتہ دار سے بھی احتیاطاً پردہ کرنا چاہیے۔ بخاری و مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ حضرت سودہ ام المومنین کا ایک بھائی لونڈی زادہ تھا (یعنی ان کے باپ کی لونڈی کے بطن سے تھا)۔ اُس کے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص کو ان کے بھائی عُتبہ نے وصیت کی کہ اس لڑکے کو اپنا بھتیجا سمجھ کر اس کی سرپرستی کرنا، کیونکہ وہ دراصل میرے نطفے سے ہے۔ یہ مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے حضرت سعد کا دعویٰ یہ کہہ کر خارج کر دیا کہ "بیٹا اُس کا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا، رہا زانی تو اس کے حصے میں کنکر پتھر"۔ لیکن ساتھ ہی آپ نے حضرت سودہ سے فرمایا کہ اس لڑکے سے پردہ کرنا (احتجبی منہ)، کیونکہ یہ اطمینان نہ رہا تھا کہ واقعی ان کا بھائی ہے۔

۱۲۲ اصل میں لفظ نِسَاءِھِنَّ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے "ان کی عورتیں"۔ اس سے کون عورتیں مراد ہیں، یہ بحث تو بعد کی ہے۔ سب سے پہلے جو بات قابلِ غور اور قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ محض "عورتوں"

(النساء) کا لفظ استعمال نہیں کیا جس سے مسلمان عورت کے لیے تمام عورتوں اور ہر قسم کی عورتوں کے سامنے بے پردہ ہونا اور اظہار زینت کرنا جائز ہو جاتا، بلکہ نِسَآئِهِنَّ کہہ کر عورتوں کے ساتھ اُس کی آزادی کو بہر حال ایک خاص دائرے تک محدود کر دیا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ دائرہ کونسا ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کونسا دائرہ ہے، اور وہ کون عورتیں ہیں جن پر لفظ نساءِ ھِنّ کا اطلاق ہوتا ہے، اس میں فقہاء اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں:۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمّی ہوں یا کسی اور قسم کی، اُن سے مسلمان عورتوں کو اُسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح اجنبی مردوں سے کیا جاتا ہے۔ ابن عباس، مجاہد اور ابن جُرَیج کی یہی رائے ہے۔ اور یہ لوگ اپنی تائید میں یہ واقعہ بھی پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عُبَیدہ کو لکھا "میں نے سنا ہے مسلمانوں کی بعض عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے لگی ہیں حالانکہ جو عورت اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے حلال نہیں ہے کہ اس کے جسم پر اس کے اہل ملت کے سوا کسی اور کی نظر پڑے"۔ یہ خط جب حضرت ابو عبیدہ کو ملا تو وہ ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "خدایا جو مسلمان عورت محض گوری ہونے کے لیے ان حماموں میں جائے اس کا منہ آخرت میں کالا ہو جائے" (ابن جریر، بیہقی، ابن کثیر)۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں ہیں۔ امام رازی کے نزدیک یہی صحیح مذہب ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر فی الواقع اللہ تعالیٰ کا منشا یہی تھا تو پھر نساءِ ھِنّ کہنے کا کیا مطلب، اس صورت میں تو النساء کہنا چاہیے تھا۔

جمہور (بقول آلوسی "اکثر السلف") کی رائے یہ ہے، اور یہی معقول بھی ہے اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی، کہ اس سے دراصل ان کے میل جول کی عورتیں، ان کی جانی بوجھی عورتیں، ان سے تعلقات رکھنے والی اور ان کے کام کاج میں حصہ لینے والی عورتیں مراد ہیں، اور مقصود اُن عورتوں کو اس دائرے سے خارج کرنا ہے جو یا تو اجنبی ہوں کہ اُن کے اخلاق و تہذیب کا حال معلوم نہ ہو، یا جن کے ظاہری حالات مشتبہ ہوں اور اُن پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔ اِس معاملے میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جائے گا وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی

اپنے مملوک[۴۴]، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں[۴۵]، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ

حالت ہے۔ شریف، باحیا اور نیک اطوار عورتیں، جو معروف اور قابلِ اعتماد خاندانوں سے تعلق رکھنے والی ہوں ان سے مسلمان عورتیں پوری طرح بے تکلف ہو سکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیا، آبرو باختہ اور بداطوار عورتیں، خواہ "مسلمان" ہی کیوں نہ ہوں، ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہیے، کیونکہ اخلاق کے لیے ان کی صحبت، غیر مردوں کی صحبت سے کچھ کم تباہ کن نہیں ہے۔ رہیں اَن جانی عورتیں جن کی حالت معلوم نہیں ہے تو ان سے ملاقات کی حد ہمارے نزدیک وہی ہے جو غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے آزادی کی زیادہ سے زیادہ حد ہو سکتی ہے، یعنی یہ کہ عورت صرف منہ اور ہاتھ ان کے سامنے کھولے، باقی اپنا سارا جسم اور آرائش چھپا کر رکھے۔

[۴۴] اس حکم کا مطلب سمجھنے میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔ ایک گروہ اس سے مراد صرف وہ لونڈیاں لیتا ہے جو کسی عورت کی ملک میں ہوں۔ ان حضرات کے نزدیک ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ لونڈی خواہ مشرکہ ہو یا اہلِ کتاب میں سے، مسلمان مالکہ اس کے سامنے تو اظہارِ زینت کر سکتی ہے مگر غلام، چاہے وہ عورت کا اپنا مملوک ہی کیوں نہ ہو، پردے کے معاملہ میں اس کی حیثیت وہی ہے جو کسی آزاد اجنبی مرد کی ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعود، مجاہد، حسن بصری، ابن سیرین، سعید بن مُسَیّب، طاؤس، اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور ایک قول امام شافعی کا بھی اسی کی تائید میں ہے۔ ان بزرگوں کا استدلال یہ ہے کہ غلام کے لیے اس کی مالکہ محرم نہیں ہے، اگر وہ آزاد ہو جائے تو اپنی اسی سابق مالکہ سے نکاح کر سکتا ہے۔ لہٰذا محض غلامی اس امر کا سبب نہیں بن سکتی کہ عورت اس کے سامنے وہ آزادی برتے جس کی اجازت محرم مردوں کے سامنے برتنے کے لیے دی گئی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ما ملکت ایمانھن کے الفاظ عام ہیں، جو لونڈی اور غلام دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، پھر اسے لونڈیوں کے لیے خاص کرنے کی کیا دلیل ہے؟ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر موقع و محل ان کا مفہوم لونڈیوں کے لیے خاص کر رہا ہے۔ پہلے نساءِ ھن فرمایا، پھر ما ملکت ایمانھن ارشاد ہوا۔ نساءِ ھن کے الفاظ سن کر عام آدمی یہ سمجھ سکتا تھا کہ اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو کسی عورت کی ملنے جلنے والی یا رشتہ دار ہوں۔ اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ شاید لونڈیاں اس میں شامل نہ ہوں۔ اس لیے ما ملکت ایمانھن کہہ کر یہ بات صاف کر دی گئی کہ آزاد عورتوں کی طرح لونڈیوں کے سامنے بھی اظہارِ زینت کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس اجازت میں لونڈی اور غلام دونوں شامل ہیں۔ یہ حضرت عائشہ اور ام سلمہ اور بعض ائمہ اہل بیت کا مذہب ہے اور امام شافعی کا مشہور قول بھی یہی ہے۔ ان کا استدلال صرف لفظ ما ملکت ایمانھن کے عموم ہی سے نہیں ہے بلکہ وہ سنت سے بھی اپنی تائید میں شواہد پیش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ واقعہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک غلام عبداللہ بن مسعدۃ الفزاری کو لیے ہوئے حضرت فاطمہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ اس وقت ایک ایسی چادر اوڑھے ہوئے تھیں جس سے سر ڈھانکتی تھیں تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر فرمایا لیس علیک باس، انما ھو ابوک و غلامک "کوئی حرج نہیں، یہاں بس تمہارا باپ ہے اور تمہارا غلام" (ابوداؤد، احمد، بیہقی بروایت انس بن مالک۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یہ غلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کو دے دیا تھا، انہوں نے اسے پرورش کیا اور پھر آزاد کر دیا، مگر اس احسان کا جو بدلہ اس نے دیا وہ یہ تھا کہ جنگ صفین کے زمانے میں وہ حضرت علی کا بدترین دشمن اور امیر معاویہ کا پرجوش حامی تھا)۔ اسی طرح وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ اذا کان لاحداکن مکاتب وکان لہ ما یؤدی فلتحتجب منہ "جب تم میں سے کوئی اپنے غلام سے مکاتبت کرے اور وہ مال کتابت ادا کرنے کی مقدرت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ ایسے غلام سے پردہ کرے" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، احمد، بروایت ام سلمہ)

ھھ اصل میں التابعین غیر اولی الاربة من الرجال کے الفاظ ہیں جن کا لفظی ترجمہ ہوگا "مردوں میں سے وہ مرد جو تابع ہوں خواہش نہ رکھنے والے"۔ ان الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محرم مردوں کے سوا دوسرے کسی مرد کے سامنے ایک مسلمان عورت صرف اس صورت میں اظہار زینت کر سکتی ہے جبکہ اس میں دو صفات پائی جاتی ہوں: ایک یہ کہ وہ تابع، یعنی زیردست اور ماتحت ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خواہش نہ رکھنے والا ہو، یعنی اپنی عمر، یا جسمانی عدم اہلیت، یا عقلی کمزوری، یا فقر و مسکنت، یا زیردستی و محکومی کی بنا پر جس میں یہ طاقت یا جرأت نہ ہو کہ صاحب خانہ کی بیوی، بیٹی، بہن یا ماں کے متعلق کوئی بری نیت دل میں لا سکے۔ اس حکم کو جو شخص بھی فرمانبرداری کی نیت سے، نہ کہ نافرمانی کی گنجائشیں ڈھونڈنے کی نیت سے، پڑھے گا وہ اول نظر ہی میں محسوس کرے گا کہ آج کل کے بیرے، خانسامے، شوفر اور دوسرے جوان جوان نوکر تو بہرحال اس تعریف میں نہیں آتے۔ مفسرین اور فقہاء نے

اس کی جو تشریحات کی ہیں ان پر ایک نظر ڈال لینے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہلِ علم ان الفاظ کا کیا مطلب سمجھتے رہے ہیں:۔

ابن عباس ——— اس سے مراد وہ سیدھا سادھا بدھو مغفل آدمی ہے جو عورتوں سے دلچسپی نہ رکھتا ہو۔

قَتَادہ ——— ایسا دست نگر آدمی جو پیٹ کی روٹی پانے کے لیے تمہارے ساتھ لگا رہے۔

مجاہد ——— ابلہ، جو روٹی چاہتا ہے اور عورتوں کا طالب نہیں ہے۔

شَعبی ——— وہ جو صاحب خانہ کا تابع و دست نگر ہو اور جس کی اتنی ہمت ہی نہ ہو کہ عورتوں پر نگاہ ڈال سکے۔

ابن زید ——— وہ جو کسی خاندان کے ساتھ لگا رہے حتیٰ کہ گویا اسی گھر کا ایک فرد بن گیا ہو اور اسی گھر میں پلا بڑھا ہو۔ جو گھر والوں کی عورتوں پر نگاہ نہ رکھتا ہو، نہ اس کی ہمت ہی کر سکتا ہو۔ وہ ان کے ساتھ اس لیے لگا رہتا ہو کہ ان سے اس کو روٹی ملتی ہے۔

طاؤس اور زہری ——— بے وقوف آدمی جس میں نہ عورتوں کی طرف رغبت ہو اور نہ اس کی ہمت۔

(ابن جریر ج ۱۸ ص ۹۵-۹۶ - ابن کثیر ج ۳ ص ۲۸۵)

ان تشریحات سے بھی زیادہ واضح تشریح وہ واقعہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیش آیا تھا اور جسے بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی اور احمد وغیرہ محدثین نے حضرت عائشہ اور امّ سلمہ سے روایت کیا ہے۔ مدینۂ طیبہ میں ایک مخنث تھا جسے ازواج مطہرات اور دوسری خواتین غیر اولی الاربہ میں شمار کر کے اپنے یہاں آنے دیتی تھیں۔ ایک روز جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ام المومنین حضرت ام سلمہ کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ نے اس کو حضرت ام سلمہ کے بھائی عبداللہ بن ابی اُمیّہ سے باتیں کرتے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل اگر طائف فتح ہو جائے تو غیلان ثقفی کی بیٹی بادیہ کو حاصل کیے بغیر نہ رہنا۔ پھر اس نے بادیہ کے حسن اور اس کے جسم کی تعریف کرنی شروع کی اور اس کے پوشیدہ اعضاء تک کی صفت بیان کر ڈالی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا "خدا کے دشمن، تو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں"۔ پھر آپ نے حکم دیا کہ اس سے پردہ کرو، آئندہ یہ گھروں میں نہ آنے پائے۔ اس کے بعد آپ نے اسے مدینہ سے باہر نکال دیا، اور دوسرے مخنثوں کو بھی گھروں میں گھسنے سے منع فرما دیا،

باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں[۴۶]۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے[۴۷]۔

اے مومنو، تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو[۴۸]، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے[۴۹]۔

کیونکہ اُن کو مخنث سمجھ کر عورتیں اُن سے احتیاط نہ کرتی تھیں اور وہ ایک گھر کی عورتوں کا حال دوسرے مردوں سے بیان کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر اولی الاربہ ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ ایک شخص جسمانی طور پر بدکاری کے لائق نہیں ہے۔ اگر اس میں دبی ہوئی صنفی خواہشات موجود ہیں اور وہ عورتوں سے دلچسپی رکھتا ہے تو بہرحال وہ بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا ہے۔

۴۶ یعنی جن میں ابھی صنفی احساسات بیدار نہ ہوئے ہوں۔ یہ تعریف زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس کی عمر تک کے لڑکوں پر صادق آسکتی ہے۔ اس سے زیادہ عمر کے لڑکے اگرچہ نابالغ ہوں، مگر ان میں صنفی احساسات بیدار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

۴۷ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حکم کو صرف زیوروں کی جھنکار تک محدود نہیں رکھا ہے، بلکہ اس سے یہ اصول اخذ فرمایا ہے کہ نگاہ کے سوا دوسرے حواس کو مشتعل کرنے والی چیزیں بھی اُس مقصد کے خلاف ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اظہار زینت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ نے عورتوں کو حکم دیا کہ خوشبو لگا کر باہر نہ نکلیں۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ ولکن لیخرجن وھن تفلات، "اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو، مگر وہ خوشبو لگا کر نہ آئیں" (ابو داؤد، احمد)۔ اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ایک عورت مسجد سے نکل کر جا رہی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ اس کے پاس سے گزرے اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے۔ انہوں نے اسے روک کر پوچھا "اے خدائے جبار کی بندی، کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟" اس نے کہا ہاں۔ بولے "مَیں نے اپنے محبوب ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں خوشبو لگا کر آئے اس کی نماز اُس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک وہ گھر جا کر غسل جنابت نہ کرے" (ابو داؤد، ابن ماجہ، احمد، نسائی)۔ ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اذا استعطرت المرأۃ فمرت علی القوم لیجدوا ریحھا فھی کذا وکذا

قال قولاً شدیداً " جو عورت عطر لگا کر راستے سے گزرے تاکہ لوگ اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے، آپ نے اس کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال فرمائے" (ترمذی، ابوداؤد، نسائی) آپ کی ہدایت یہ تھی کہ عورتوں کو وہ خوشبو استعمال کرنی چاہیے جس کا رنگ تیز ہو اور بُو ہلکی ہو (ابوداؤد)

اسی طرح آپ نے اس بات کو بھی ناپسند فرمایا کہ عورتیں بلا ضرورت اپنی آواز مردوں کو سنائیں۔ ضرورت پڑنے پر بات کرنے کی اجازت تو خود قرآن میں دی گئی ہے، اور لوگوں کو دینی مسائل خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بتایا کرتی تھیں۔ لیکن جہاں اس کی نہ ضرورت ہو اور نہ کوئی دینی یا اخلاقی فائدہ، وہاں اس بات کو پسند نہیں کیا گیا ہے کہ عورتیں اپنی آواز غیر مردوں کو سنائیں۔ چنانچہ نماز میں اگر امام بھول جائے تو مردوں کو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہیں، مگر عورتوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مار کر امام کو متنبہ کریں۔ التسبیح للرجال و التصفیق للنساء (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

۸ کے یعنی اُن لغزشوں اور غلطیوں سے جو اس معاملے میں اب تک کرتے رہے ہو، اور آئندہ کے لیے اپنے طرز عمل کی اصلاح اُن ہدایات کے مطابق کر لو جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہیں۔

۴۹ کے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن دوسری اصلاحات کا بھی ایک خلاصہ دے دیا جائے جو ان احکام کے نزول کے بعد قرآن کی روح کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے میں رائج فرمائیں۔

(۱) آپ نے محرم رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں دوسرے لوگوں کو (خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں) کسی عورت سے تنہا ملنے اور اس کے پاس تنہا بیٹھنے سے منع فرما دیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا لا تلجوا علی المغیبات فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم "جن عورتوں کے شوہر باہر گئے ہوئے ہوں ان کے پاس نہ جاؤ، کیونکہ شیطان تم میں سے ایک شخص کے اندر خون کی طرح گردش کر رہا ہے" (ترمذی)۔ انہی حضرت جابر کی دوسری روایت ہے کہ حضور نے فرمایا من کان یومن باللہ والیوم الاٰخر فلا یخلون بامرأۃ لیس معھا ذو محرم منھا فان ثالثھما الشیطان "جو شخص اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتا ہو وہ کبھی کسی عورت سے تنہائی میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس عورت کا کوئی محرم نہ ہو، کیونکہ تیسرا اُس وقت شیطان ہوتا ہے" (احمد)۔ قریب قریب اسی مضمون کی ایک اور روایت امام احمد نے عامر بن

ربیعہ سے نقل کی ہے۔ اس معاملے میں حضور کی اپنی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ رات کے وقت آپ حضرت صفیہؓ کے ساتھ اُن کے مکان کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں دو انصاری پاس سے گزرے۔ آپ نے ان کو روک کر ان سے فرمایا یہ میرے ساتھ میری بیوی صفیہ ہیں۔ انہوں نے عرض کیا سبحان اللہ، یا رسول اللہ، بھلا آپ کے متعلق بھی کوئی بدگمانی ہو سکتی ہے؟ فرمایا شیطان آدمی کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہیں وہ تمہارے دل میں کوئی برا گمان نہ ڈال دے (ابوداؤد، کتاب الصوم)۔

(۲) آپ نے اس کو بھی جائز نہیں رکھا کہ کسی مرد کا ہاتھ کسی غیر محرم عورت کے جسم کو لگے۔ چنانچہ آپ مردوں سے بیعت تو ہاتھ میں لیکر کرتے تھے لیکن عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ آپ نے کبھی اختیار نہیں فرمایا۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی کسی غیر عورت کے جسم کو نہیں لگا۔ آپ عورت سے صرف زبانی عہد لیتے تھے اور جب وہ عہد کر چکتی تھی تو فرماتے، جاؤ بس تمہاری بیعت ہو گئی" (ابوداؤد، کتاب الخراج)۔

(۳) آپ نے عورت کو محرم کے بغیر تنہا یا غیر محرم کے ساتھ سفر کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرما دیا۔ بخاری و مسلم میں ابن عباس کی روایت ہے کہ حضور نے خطبہ میں فرمایا لا یخلون رجل بامرأة الا ومعھا ذو محرم، ولا تسافر المرأة الا مع ذی محرم، "کوئی مرد کسی عورت سے خلوت میں نہ ملے جب تک کہ اس کے ساتھ اس کا کوئی محرم نہ ہو، اور کوئی عورت سفر نہ کرے جب تک کہ اس کا کوئی محرم اس کے ساتھ نہ ہو" ایک شخص نے اٹھ کر عرض کیا میری بیوی حج کو جا رہی ہے اور میرا نام فلاں مہم پر جانے والوں میں لکھا جا چکا ہے۔ حضور نے فرمایا فانطلق فحج مع امرأتك "اچھا تو تم اپنی بیوی کے ساتھ حج کو چلے جاؤ"۔ اس مضمون کی متعدد احادیث ابن عمر، ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے معتبر کتب حدیث میں مروی ہیں جن میں صرف مدتِ سفر یا مسافتِ سفر کے اعتبار سے اختلاف بیان ہے، مگر اس امر میں اتفاق ہے کہ کسی مومن عورت کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کو مانتی ہو، محرم کے بغیر سفر کرنا حلال نہیں ہے۔ ان میں سے کسی حدیث میں ۱۲ میل یا اس سے زیادہ کے سفر پر پابندی کا ذکر ہے، کسی میں ایک دن، کسی میں ایک شب و روز، کسی میں دو دن اور کسی میں تین دن کی حد بتائی گئی ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان احادیث کو نہ تو ساقط الاعتبار بنا دیتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے کر اس حد کو قانونی مقدار قرار دینے کی کوشش کریں جو اس روایت میں بیان ہوئی ہو۔ اس لیے

کہ اس اختلاف کی یہ معقول وجہ سمجھ میں آسکتی ہے کہ مختلف مواقع پر جیسی صورتِ معاملہ حضور کے سامنے پیش ہوئی ہو اسی کے لحاظ سے آپ نے حکم بیان فرمایا ہو۔ مثلاً کوئی عورت تین دن کی مسافت پر جارہی ہو اور آپ نے اسے محرم کے بغیر جانے سے منع فرمایا ہو، اور کوئی ایک دن کی مسافت پر جارہی ہو اور آپ نے اسے بھی روک دیا ہو۔ اس میں مختلف سائلوں کے الگ الگ حالات اور ہر ایک کو آپ کے مختلف جوابات اصل چیز نہیں ہیں، بلکہ اصل چیز وہ قاعدہ ہے جو اوپر ابن عباس والی روایت میں ارشاد ہوا ہے، یعنی سفر جسے عرفِ عام میں سفر کہا جاتا ہے، محرم کے بغیر کسی عورت کو نہ کرنا چاہیے۔

(۴) آپ نے عورتوں اور مردوں کے اختلاط کو روکنے کی عملاً بھی کوشش فرمائی اور قولاً بھی اس سے منع فرمایا۔ اسلامی زندگی میں جمعہ اور جماعت کی جو اہمیت ہے، کسی صاحبِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ جمعہ کو اللہ نے خود فرض کیا ہے۔ اور نماز باجماعت کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بلاعذر مسجد میں حاضر نہ ہو اور اپنے گھر میں نماز پڑھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے مطابق اس کی نماز مقبول ہی نہیں ہوتی (ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، حاکم، بروایت ابنِ عباس)۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو جمعہ کی فرضیت سے مستثنیٰ قرار دیا (ابوداؤد بروایت ام عطیہ، دارقطنی و بیہقی بروایتِ جابر، ابوداؤد و حاکم بروایت طارق بن شہاب) اور نماز باجماعت میں عورتوں کی شرکت نہ صرف یہ کہ لازم نہیں رکھی بلکہ اس کی اجازت ان الفاظ میں دی کہ اگر وہ آنا چاہیں تو انہیں روکو نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ تصریح بھی فرمادی کہ ان کے لیے گھر کی نماز مسجد کی نماز سے افضل ہے۔ ابن عمر اور ابوہریرہ کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ "اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے منع نہ کرو" (ابوداؤد)۔ دوسری روایات ابن عمر سے ان الفاظ اور ان سے ملتے جلتے الفاظ میں ہیں [ائذنوا للنساء الی المساجد باللیل "عورتوں کو رات کے وقت مسجدوں میں آنے کی اجازت دو" (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد) اور ایک روایت ان الفاظ میں ہے لا تمنعوا نساءکم المساجد و بیوتھن خیر لھن "اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے روکو نہیں، اگرچہ ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں" (احمد، ابوداؤد)۔ ام حُمید ساعدیہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے آپ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ فرمایا "تمہارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ اور تمہارا اپنے گھر

میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے، اور تمہارا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے" (احمد، طبرانی)۔ قریب قریب اسی مضمون کی روایت ابوداؤد میں عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ اور حضرت ام سلمہ کی روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں خیر مساجد النساء قعر بیوتھن، "عورتوں کے لیے بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں" (احمد، طبرانی)۔ لیکن حضرت عائشہ دورِ بنی امیہ کی حالت دیکھ کر فرماتی ہیں "اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھتے جو اب ہیں تو ان کا مسجدوں میں آنا اسی طرح بند فرما دیتے جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کا آنا بند کیا گیا تھا" (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔ مسجد نبوی میں حضور نے عورتوں کے داخل ہونے کے لیے ایک الگ دروازہ مخصوص کر دیا تھا، اور حضرت عمر اپنے دورِ حکومت میں مردوں کو اس دروازے سے آنے جانے کی سخت ممانعت فرماتے تھے (ابوداؤد، باب اعتزال النساء فی المساجد اور باب ما جاء فی خروج النساء الی المساجد)۔ جماعت میں عورتوں کی صفیں مردوں سے پیچھے رکھی جاتی تھیں اور نماز کے خاتمے پر حضور سلام پھیرنے کے بعد کچھ دیر توقف فرماتے تھے تاکہ مردوں کے اٹھنے سے پہلے عورتیں اٹھ کر چلی جائیں (احمد، بخاری بروایت ام سلمہ) اور آپ کا ارشاد تھا کہ مردوں کی بہترین صف سب سے آگے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے پیچھے (یعنی عورتوں سے قریب) کی صف۔ اور عورتوں کی بہترین صف سب سے پیچھے کی صف ہے اور بدترین صف سب سے آگے کی (یعنی مردوں سے قریب کی) صف ہے (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، احمد)۔ عیدین کی نماز میں عورتیں شریک ہوتی تھیں مگر ان کی جگہ مردوں سے الگ تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبے کے بعد عورتوں کی طرف جا کر ان کو الگ خطاب فرماتے تھے (ابوداؤد بروایت جابر بن عبداللہ۔ بخاری و مسلم بروایت ابن عباس)۔ ایک مرتبہ مسجد نبوی کے باہر آنحضرت نے دیکھا کہ راستے میں مرد اور عورت سب گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس پر آپ نے عورتوں سے فرمایا استأخرن فانه لیس لکن ان تحققن الطریق، علیکن بحافات الطریق۔ "ٹھیر جاؤ، تمہارے لیے سڑک کے بیچ میں چلنا درست نہیں ہے، کنارے پر چلو۔" یہ ارشاد سنتے ہی عورتیں کنارے ہو کر دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں (ابوداؤد)۔ ان احکام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی مخلوط مجلس اسلام کے مزاج سے کیسی سخت مغائرت رکھتی ہے۔ جو دین خدا کے گھر میں عبادت کے موقع پر بھی دونوں صنفوں کو خلط ملط

نہیں ہونے دیتا اس کے متعلق کون تصور کر سکتا ہے کہ وہ کالجوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور جلسوں میں اسی اختلاط کو جائز رکھے گا۔

(۵) عورتوں کو اعتدال کے ساتھ بناؤ سنگھار کرنے کی آپ نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ بسا اوقات خود اس کی ہدایت فرمائی ہے، مگر اس میں حد سے گزر جانے کو بڑی سختی کے ساتھ روکا ہے۔ اس زمانے میں جس قسم کے بناؤ سنگھار عرب کی عورتوں میں رائج تھے ان میں سے حسب ذیل چیزوں کو آپ نے قابل لعنت اور سبب ہلاکت اقوام قرار دیا: اپنے بالوں میں دوسرے بال ملا کر ان کو زیادہ لمبا اور گھنا دکھانے کی کوشش کرنا۔ جسم کے مختلف حصوں کو گودنا اور مصنوعی تل بنانا۔ بال اکھاڑ اکھاڑ کر بھویں خاص وضع کی بنانا اور رونئیں نوچ نوچ کر منہ صاف کرنا۔ دانتوں کو گھس گھس کر باریک بنانا۔ یا دانتوں کے درمیان مصنوعی چھیلیاں پیدا کرنا۔ زعفران یا ورس وغیرہ کے مصنوعی ابٹنے مل کر چہرے پر مصنوعی رنگ پیدا کرنا۔ یہ احکام صحاح ستہ اور مسند احمد میں حضرت عائشہ، حضرت اسماء بنت ابی بکر، حضرت عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، اور امیر معاویہ سے معتبر سندوں کے ساتھ مروی ہیں۔

اللہ اور رسول کی ان صاف صاف ہدایات کو دیکھ لینے کے بعد ایک مومن انسان کے لیے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں: یا تو وہ ان کی پیروی کرے اور اپنی، اپنے گھر کی اور اپنے معاشرے کی زندگی کو ان اخلاقی فتنوں سے پاک کر دے جن کے سد باب کے لیے اللہ نے قرآن میں اور اس کے رسول نے سنت میں اس قدر تفصیلی احکام دیئے ہیں۔ یا پھر اگر وہ اپنے نفس کی کمزوری کے باعث ان کی یا ان میں سے کسی کی خلاف ورزی کرتا ہے تو کم از کم اسے گناہ سمجھتے ہوئے کرے اور اس کو گناہ مانے، اور خواہ مخواہ کی تاویلوں سے گناہ کو صواب بنانے کی کوشش نہ کرے۔ ان دونوں صورتوں کو چھوڑ کر جو لوگ قرآن و سنت کے صریح احکام کے خلاف مغربی معاشرت کے طور طریقے اختیار کر لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ پھر انہی کو عین اسلام ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور علانیہ دعوے کرتے پھرتے ہیں کہ اسلام میں سرے سے پردے کا حکم موجود ہی نہیں ہے، وہ گناہ اور نافرمانی پر جہالت اور منافقانہ ڈھٹائی کا اور اضافہ کر لیتے ہیں جس کی قدر نہ دنیا میں کوئی شریف آدمی کر سکتا ہے نہ آخرت میں خدا سے اس کی امید کی جا سکتی ہے لیکن مسلمانوں میں تو منافقوں سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا اور رسول کے ان احکام کو غلط

(بقیہ صفحہ ۲۹۱ پر)

سنّتِ خلفائے راشدین

جناب مولانا امین احسن اصلاحی

[ترجمان القرآن شمارہ ماہ اکتوبر ۱۹۵۵ء میں جناب مولانا امین احسن اصلاحی کا جو مضمون حدیث سے متعلق چند سوالات کو صاف کرنے کے لیے شائع ہوا تھا اسے پڑھکر ایک صاحب نے مولانا سے یہ دریافت کیا ہے کہ سنت کو معلوم کرنے کے ذرائع میں آپ نے خلفائے راشدین کے تعامل کو بھی گنوایا ہے اور دلیل میں یہ فرمودہ رسالت آب (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کیا ہے کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین، سو یہ قول کہاں سے ماخوذ ہے اور آجکل مدخلفائے راشدین کی اصطلاح سے ذہن جن خلفائے اربعہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ کیا خود آنحضور صلعم کا معہود ذہنی بھی یہی تھا، نیز کیا خلفائے راشدین کے الفاظ اس دور میں اسی طرح مستعمل تھے؟ جواباً مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے جو تصریحات کی ہیں وہ ایک مستقل مضمون کی شکل اختیار کر گئی ہیں جو درج ذیل ہے۔ (ادارہ)]

جواب۔ "علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین" محض کسی "عبارت" کا ایک ٹکڑا نہیں ہے، بلکہ یہ

(بقیہ تفہیم القرآن)

اور ان طور طریقوں کو صحیح و برحق سمجھتے ہیں جو انہوں نے غیر مسلم قوموں سے سیکھے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت مسلمان نہیں ہیں، کیونکہ اس کے بعد بھی اگر وہ مسلمان ہوں تو پھر اسلام اور کفر کے الفاظ قطعاً بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے نام بدل دیتے اور علانیہ اسلام سے نکل جاتے تو ہم کم از کم ان کی اخلاقی جرأت کا اعتراف کرتے۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ خیالات رکھتے ہوئے بھی وہ مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ انسانیت کی اس سے زیادہ ذلیل قسم غالباً دنیا میں اور کوئی نہیں پائی جاتی۔ اس سیرت و اخلاق کے لوگوں سے کوئی جعل سازی، کوئی فریب، کوئی دغابازی اور کوئی خیانت بھی خلافِ توقع نہیں ہے۔

ایک طویل حدیثِ نبویؐ کا ایک حصہ ہے، جو احمد، ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالہ سے مشکوٰۃ کے باب الاعتصام بالکتاب والسنہ میں، عرباض بن ساریہ سے، بایں الفاظ نقل ہوئی ہے:۔

عن العرباض بن ساریۃ قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم ثم اقبل علینا بوجھہ فوعظنا موعظۃ بلیغۃ ذرفت منہا العیون ووجلت منہا القلوب فقال رجل یارسول اللہ کان ھٰذہ موعظۃ مودع فاوصنا فقال اوصیکم بتقوی اللہ والسمع والطاعۃ وان کان عبداً حبشیاً فانہ من یعش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔

عرباض بن ساریہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، پھر حضور ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ایک نہایت موثر خطبہ دیا جس سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔ مجمع سے ایک شخص بولا، حضور! یہ تو ایک وداعی خطبہ معلوم ہوتا ہے تو ہمیں کچھ وصیت کیجیے۔ آپ نے فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرتے رہنے اور اپنے صاحب امر کی بات ماننے اور اس کی اطاعت کرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں، اگرچہ تمہارا صاحب امر کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ اب اور تب میں بڑا فرق محسوس کریں گے تو تم میری سنت کی اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کی پیروی کرنا، ان کو مضبوطی سے تھامنا اور دانت سے پکڑنا۔ اور دین میں جو نئی باتیں گھسائی جائیں ان سے خبردار رہنا کیونکہ ہر ایسی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس حدیث میں دیکھ لیجیے "سنۃ الخلفاء الراشدین" کے الفاظ صاف موجود ہیں، بلکہ راشدین کے بعد ایک لفظ "مہدیین" کا اضافہ بھی ہے۔ اس میں نہایت واضح الفاظ میں حضورؐ نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کا ذکر بھی فرمایا ہے اور اپنی سنت ہی کی طرح اس پر قائم رہنے کی وصیت بھی فرمائی ہے۔

رہا یہ سوال کہ جس طرح آج خلفائے راشدین کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو اس سے خلفائے اربعہ مراد

ہوتے ہیں اسی طرح جب حضورؐ نے یہ الفاظ استعمال فرمائے تو کیا اس وقت بھی لوگوں نے ان الفاظ سے خلفائے اربعہ ہی کو سمجھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کلام کی نوعیت ایک واضح اور قطعی حکم کی نہیں ہے بلکہ جیسا کہ خود حدیث سے واضح ہے ایک پیشینگوئی اور ایک وصیت کی ہے اور خلفائے راشدین سے یہاں متعین یا مخصوص اشخاص مراد نہیں ہیں، بلکہ آپ کے وہ جانشین مراد ہیں جو آپ کے بعد آپ کی امت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں گے اور حضورؐ ہی کے طریقہ پر اپنے فرائض انجام دیں گے۔ اس لفظ کے اندر وہ تمام خلفائے راشدین داخل ہیں جو آپ کی امت کے اندر پیدا ہوئے یا آئندہ پیدا ہوں گے اور حکومت کے فرائض صحیح اسلامی طریق پر انجام دیں گے

اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ حضورؐ کے ذہن میں اپنے بعد کسی خلافت کے قیام یا خلفاء کے کسی سلسلہ کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا تو ہمارے نزدیک یہ گمان بالکل غلط ہے۔ اول تو آپ جس دین حق کے داعی تھے وہ دین کوئی رہبانیت کا دین نہیں تھا کہ وہ کسی سیاسی نظام کے تصور سے بالکل خالی ہو بلکہ اس کے برعکس وہ روز اول ہی سے ایک اجتماعی اور سیاسی نظام کے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ خود حضورؐ کی زندگی ہی میں اس نے عملاً ایک مکمل سیاسی نظام کی صورت اختیار بھی کر لی تھی اور اس نظام کے اصول و مبادی قرآن میں بھی بیان ہو گئے تھے اور خود حضورؐ نے بھی ان کی وضاحت فرما دی تھی۔ ثانیاً حضورؐ کو آپ کی امت کے مستقبل کا پورا نقشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی دکھا دیا گیا تھا۔ چنانچہ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کو اپنی اجتماعی زندگی میں جن مراحل اور جن انقلابات سے گذرنا تھا اس کے بہت سے پہلو آپ کے علم میں تھے، آپ جانتے تھے کہ آپ کے بعد مسلمانوں میں کس قسم کا نظام قائم ہو گا، اس کے بعد کیا انقلاب ہو گا اور پھر اس انقلاب کے بعد کیا حالات پیش آئیں گے۔ حد یہ ہے کہ خلفائے اربعہ میں سے جس جس کو جس جس طرح کے حالات پیش آنے تھے حضورؐ نے ان کی طرف بھی اپنی پیشین گوئیوں میں اشارات فرمائے ہیں۔ ہم یہاں بعض حدیثیں نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ آپ اپنے بعد قائم ہونے والے نظام کی نوعیت سے بھی باخبر تھے اور ان انقلابات سے بھی واقف تھے جن سے اس نظام کو سابقہ پیش آنا تھا۔

عن ابی عبیدۃ و معاذ بن جبل عن رسول اللہ ﷺ | ابو عبیدہ اور معاذ بن جبل راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم قال ان ھٰذا الامر بدأ نبوۃ ورحمۃ ثم یکون خلافۃ ورحمۃ ثم ملکا عضوضا ثم کائن جبریۃ وعتوا وفسادا فی الارض یستحلون الحریر والفروج والخمور یرزقون علی ذالک وینصرون حتی یلقوا اللہ۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

(مشکوٰۃ باب تغیر الناس)

علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نظام کا آغاز نبوت اور رحمت کی شکل میں ہوا ہے۔ اس کے بعد یہ خلافت اور رحمت کی صورت اختیار کرے گا۔ پھر ایک مستبد بادشاہی بن جائیگا۔ پھر قہر و جبر اور فساد فی الارض بن کر رہ جائے گا۔ لوگ ریشم، زنا اور شراب کو جائز کرلیں گے۔ اس کے باوجود انہیں روزی بھی ملتی رہے گی اور یہ فتوحات بھی حاصل کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ اللہ کے ہاں حاضر ہوں۔

ایک دوسری حدیث میں بعد کے انقلابات اور ادوار کی تفصیل اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے، ملاحظہ ہو۔

عن حذیفۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکون النبوۃ فیکم ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہ اللہ تعالیٰ ثم تکون ملکاً عاضاً فتکون ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ ثم یکون ملکاً جبریۃ فتکون ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعہا اللہ تعالیٰ ثم تکون خلافۃ علی منہاج نبوۃ ثم سکت ... رواہ احمد والبیہقی فی دلائل النبوۃ

(مشکوٰۃ باب الانذار والتحذیر)۔

حذیفہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں نبوت باقی رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ اس کا باقی رہنا چاہے پھر اس کو اللہ تعالیٰ اٹھا لیگا۔ اس کے بعد نبوت کے طرز پر خلافت قائم ہوگی اور وہ قائم رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھا لیگا۔ اس کے بعد ایک مستبد سلطنت قائم ہو جائے گی اور وہ قائم رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھا لیگا۔ پھر جبر و قہر کی حکومت قائم ہوگی اور وہ قائم رہے گی جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو اٹھا لیگا۔ اس کے بعد نبوت کے طریق پر پھر خلافت قائم ہوگی۔ یہاں تک بیان کرنے کے بعد حضور خاموش ہوگئے۔

اس حدیث میں خلافت علی منہاج النبوۃ کے بعد پیدا ہونے والے بگاڑ کے بعد پھر ایک دور خلافت علی منہاج

النبوۃ کی پیشین گوئی ہے۔ اس کا مصداق ہمارے سلف صالحین نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور کو قرار دیا ہے اور اس کے بعد حضور کے سکوت فرمانے سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ اس کے بعد بھی بناؤ اور بگاڑ کے اس طرح کے دور امت میں آتے رہیں گے۔ چنانچہ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ اس کے بعد اچھے حکمران بھی پیدا ہوئے اور برے بھی پیدا ہوئے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ آئندہ کبھی اس دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور نہیں آئے گا۔ نہ نقل میں ہمیں کوئی چیز ایسی ملتی ہے جو اس کا دروازہ بند کرتی ہو اور نہ عقلاً اس کا آنا کسی طرح محال اور مستبعد قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث انہی حضرت حذیفہ سے مسلم و بخاری دونوں کے حوالہ سے مشکوٰۃ کی کتاب الفتن میں اس طرح نقل ہوئی ہے۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں۔

لوگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خیر کی بابت پوچھا کرتے تھے لیکن میں فتنوں کی بابت سوال کیا کرتا تھا کہ مبادا کسی فتنہ سے سابقہ نہ پڑ جائے۔ ایک مرتبہ میں نے حضور سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ، ہم جاہلیت اور فتنہ کی تاریکی میں مبتلا تھے کہ اللہ نے ہمیں یہ نبوت کی نعمت بخشی۔ کیا اس خیر کے بعد پھر بگاڑ پیدا ہوگا؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا کہ کیا اس بگاڑ کے بعد پھر خیر کا دور بھی آئیگا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ لیکن اس خیر میں کچھ کدورت بھی ملی ہوئی ہوگی۔ میں نے پوچھا اس کدورت کی نوعیت کیا ہوگی؟ آپ نے ارشاد فرمایا لوگ میری سنت اور میرے طریقہ کے خلاف روش اختیار کریں گے۔ ان سے معروف و منکر دونوں طرح کی باتیں صادر ہونگی۔ میں نے دریافت کیا کیا اس خیر کے بعد پھر شر کا ظہور ہوگا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔۔۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور سے متعلق یہ حقیقت بھی واضح تھی کہ اس دور میں اگرچہ خلیفہ تو راشد ہوگا لیکن وقت کے حکام اور عوام کی حالت شر کی کدورت سے پاک نہیں ہوگی، ان کے اندر معروف اور منکر دونوں طرح کی باتیں پائی جائیں گی۔

بعض احادیث میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے پہلے دور کی مدت بھی حضور نے متعین فرما دی۔ چنانچہ مشکوٰۃ میں احمد، ترمذی اور ابو داؤد کے حوالہ سے یہ روایت نقل ہوئی ہے۔

الخلافۃ ثلاثون سنۃ ثم یکون ملکا — خلافت تیس سال تک رہے گی اس کے بعد بادشاہی قائم

ہو جائیگی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ حضور کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت ۲ سال رہی۔ حضرت عمرؓ نے ۱۰ سال خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی بالترتیب ۱۲ اور ۶ سال خلیفہ رہے۔ یہ کل ملا کر ۳۰ سال ہوتے ہیں۔

ان احادیث سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ حضور کا ذہن، جیسا کہ عرض کیا گیا، نہ خلافت کے تصور سے خالی تھا اور نہ خلفاء کے تصور سے۔ آپ جس دینِ فطرت کو لے کر آئے تھے اس کے فطری تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ نیز جیسا کہ اوپر بیان ہوا آپ کے بعد جس طرح کا سیاسی و اجتماعی نظام امت میں قائم ہونا تھا اس کے اصول خود قرآن میں بھی بتا دیئے گئے تھے اور ان کی تفصیلات خود حضور نے بھی مختلف طریقوں سے لوگوں کو سمجھائی تھیں۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام انقلابات کا مشاہدہ بھی کرا دیا تھا جو آپ کی امت کی اجتماعی و سیاسی زندگی میں پیش آنے والے تھے۔ یہاں تک کہ یہ بھی آپ پر واضح کر دیا گیا تھا کہ آپ کے بعد جو لوگ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں گے وہ اس فرض کی ادائیگی میں کن صلاحیتوں کا ثبوت دیں گے اور ان کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اگر خوفِ طوالت مانع نہ ہوتا تو ہم یہ تفصیلات بھی یہاں پیش کر دیتے۔

جب یہ ساری باتیں حضور پر روشن تھیں تو اس بات پہ کیوں تعجب کیا جائے کہ آپ نے علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین کے الفاظ کے ساتھ خلفاء کے دور کے ظہور میں آنے سے پہلے اس کا تعارف کرایا اور ان کی سنت کی پیروی کرنے کی مسلمانوں کو وصیت فرمائی؟

آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کا ذہن ان الفاظ کو سن کر ان سے تعین کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی طرف نہیں منتقل ہو سکتا تھا لیکن حضور کے ارشاد میں نہ یہ تعین پیشِ نظر ہے اور نہ یہ الفاظ اس تعین کے متقاضی ہی ہیں اور نہ ہی اصل وصیت کے نقطۂ نظر سے یہ تعین کچھ ضروری ہے۔ عام مسلمانوں کا اس سے صرف اتنا سمجھ لینا اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل کافی تھا کہ آپ کے بعد امت کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے خلفاء ہوں گے جن میں راشد بھی ہوں گے اور غیر راشد بھی۔ اور ہمیں ان میں سے راشدین کی سنت کی پیروی کرنی ہے اور غیر راشدین کے ساتھ شریعت کے

مقررہ کردہ حدود کے اندر معاملہ کرنا ہے۔

خلفائے راشدین کے تعامل کے سنت ہونے کا مفہوم | یہاں میں تھوڑی سی وضاحت اس بات کی بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ خلفائے راشدین کے تعامل کے سنت ہونے کا مفہوم کیا ہے اور اس کو سنت کا درجہ دینے کی وجہ کیا ہے؟

میں نے اپنے اصل مضمون میں سنت اور حدیث میں جو فرق بیان کیا ہے وہ یہاں بھی ملحوظ رکھیے۔ میں نے بتایا تھا کہ حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کے ساتھ کی جائے لیکن سنت صرف وہی چیزیں ہیں جن کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اہتمام و التزام کیا ہو، جن کی اہمیت کے ساتھ تاکید فرمائی ہو، جن کی حیثیت آپ کی زندگی میں معلوم و معروف حقیقتوں کی ہو، جن کو حضور نے انفرادی یا اجتماعی زندگی کے لیے ایک رویہ، ایک مسلک اور ایک پروگرام کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے رکھا ہو اور اسی حیثیت سے ان پر عمل کیا او کرایا ہو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد جب آپ خلفائے راشدین کی سنت کے معاملہ پر غور فرمائیں گے تو جہاں تک ان کے انفرادی اعمال و آرا کا تعلق ہے وہ ان کی سنت کی حیثیت نہیں حاصل کریں گے، بلکہ ان کی صرف وہی چیزیں ان کی سنت کی حیثیت حاصل کریں گی جو ان کے سامنے ایک مسئلہ کی حیثیت سے آئی ہوں اور انہوں نے ان پر اپنے وقت کے اہلِ علم اور ارباب حل و عقد سے مشورہ حاصل کر کے ان کے بارہ میں کوئی فیصلہ کیا ہو یا بطور خود اپنے کسی فیصلہ یا اجتہاد کو نافذ کیا ہو اور ان کے زمانہ کے اہلِ علم و تقویٰ نے اس کو بغیر کسی نکیر کے قبول کیا ہو اور وہ چیز معمول بہ بن گئی ہو۔

حضرات خلفائے راشدین کا عام طریقہ یہ رہا ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی ایسا معاملہ آتا جس کے بارے میں قرآن یا سنتِ نبوی میں کوئی تصریح موجود نہ ہوتی تو اس میں اہلِ علم و تقویٰ سے مشورہ کرتے۔ مشورے کے بعد جب ایک بات طے کر لیتے تو وہ چیز سب کے نزدیک متفق علیہ بن جاتی۔ پھر اگر اس کو پورے ملک کے لیے ایک قانون کی حیثیت دے دینے کی ضرورت داعی ہوتی تو وہی چیز پورے ملک کے لیے ایک قانون کی حیثیت حاصل کر لیتی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانوں میں اس کی بے شمار

مثالیں موجود ہیں۔ اسلام میں اجماع جو حجت مانا گیا ہے تو اس کی معیاری شکل بھی دراصل حقیقت یہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ اس حقیقت کی طرف شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفا میں اشارہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"وتحقیق آنست کہ تا زمان حضرت عثمان اختلاف در مسائل فقہیہ واقع نمی شد۔ در محل اختلاف بخلیفہ رجوع می کردند وخلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار می کرد، ہماں امر مجمع علیہ می شد۔"

اور تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک فقہی مسائل میں کسی مستقل اختلاف کی صورت پیدا نہیں ہونے پاتی تھی۔ اگر کوئی اختلافی مسئلہ سامنے آتا تو اس کے لیے خلیفہ وقت کی طرف رجوع کرتے، خلیفہ اپنے وقت کے اہل حل وعقد سے مشورہ حاصل کرنے کے بعد اس معاملہ میں کوئی پہلو اختیار کر لیتا اور وہی بات سب کے نزدیک متفق علیہ بن جاتی۔

میرے نزدیک سنتِ خلفاء سے مراد ان کے اسی طرح کے اجماعی فیصلے ہیں، نہ کہ ان کی انفرادی رائیں۔

اب میں یہ بتاؤنگا کہ میں خلفائے راشدین کے اس طرح کے طے کردہ مسائل کو کیوں سنت کا درجہ دیتا ہوں۔ میرے نزدیک اس کے وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اس کی پہلی وجہ تو وہ حدیث ہے جو اوپر گذر چکی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود خلفائے راشدین کی سنت کو سنت کا درجہ بخشا ہے اور اسی حیثیت سے مسلمانوں کو اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت اور وصیت فرمائی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اجماع ہمارے ہاں ایک شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے اور اجماع کی سب سے اعلیٰ قسم اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہی ہو سکتی ہے جس کی مثالیں خلفائے راشدین کے عہد میں ملتی ہیں۔ اولاً تو یہ خیر القرون کے لوگوں کا اجماع ہے جن کی حق طلبی و حق کوشی ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ ثانیاً اسی مبارک دور میں عملاً یہ شکل اختیار کی جا سکی کہ اگر کوئی مسئلہ پیش آیا تو اس میں وقت کے اہلِ علم اور صالحین کی رائیں معلوم کی گئیں اور پھر ایک متفق علیہ بات طے کر کے ایک خلیفہ راشد نے اس کو جاری و نافذ کیا اور سب نے اس پر بغیر کسی اختلاف و اعتراض کے عمل کیا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابتدا سے خلفائے راشدین کے تعامل کو ملت میں ایک مستقل شرعی حجت کی حیثیت دی گئی ہے۔ سعید ابن مسیب کی فقہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے فیصلوں کو ایک اصولی چیز کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح ابراہیم نخعی کی فقہ میں حضرت علیؓ کے فیصلوں کو ایک مستقل جگہ حاصل ہے۔ یہی اعتماد ہر مسلمان کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فیصلوں پر ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو فقہ مالکی ہو یا فقہ حنفی، ہر ایک کے اندر خلفائے راشدین کے تعامل کو سنت ہی کی حیثیت سے جگہ دی گئی ہے۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ دین کی تکمیل اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی ہے لیکن امت کی اجتماعی زندگی میں اس کے مضمرات کا پورا پورا اظہار حضرات خلفائے راشدین کے ہاتھوں ہوا۔ انہی کے مبارک دور میں اسلام کے تمام ادیان پر غلبہ کا قرآنی وعدہ پورا ہوا اور اسلامی شریعت کے بہت سے احکام کا انطباق زندگی کے معاملات میں عملاً متعین ہوا۔ اس پہلو سے خلفائے راشدین کا دور گویا عہد رسالت ہی کا ایک ضمیمہ ہے اور ہمارے لیے وہ پورا نظام ایک مثالی نظام ہے جو ان کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوا۔ پس اس دور میں جو نظائر قائم ہو چکے ہیں وہ ہمارے لیے دینی حجت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمارے لیے ان سے انحراف جائز نہیں ہے۔ اس کلیہ سے اگر کوئی چیز مستثنیٰ ہو سکتی ہے تو صرف وہ چیز ہو سکتی ہے جو محض کسی وقتی مصلحت کے تحت انہوں نے اختیار فرمائی ہو۔

محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

(مدنی دور)

نعیم صدیقی

انسانیت کے محسنِ اعظم اور دنیا کے سب سے بڑے تاریخ ساز حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامۂ حیات کا مکی دور دعوت و پیغام کا دور ہے اور مدنی دور اقتدار کا دور ہے۔ مکہ میں افراد تیار کیے گئے مدینہ میں اجتماعی نظام کی تشکیل ہوئی۔ یہاں مسالہ تیار ہوا، وہاں عمارت کھڑی کی گئی۔

اس فرق کی وجہ سے قرآن اور سیرت و تاریخ کو سرسری نگاہ سے دیکھنے والے عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ اسلامی تحریک اور اس کے داعی پر امتحان کی کڑی گھڑیاں صرف مکی دور ہی میں بیتی ہیں، مدینہ میں مخالفت کے ویسے شدید طوفانوں سے سابقہ نہ تھا اور یہاں اس طرح کی بھٹیاں گرم نہ ہوتی تھیں۔ یا کم سے کم خیال یہ کیا جاتا ہے کہ مخالفت اب ایک ننگی تلوار بن کر میدانِ جنگ میں آگئی تھی اور مخالفین کی طرف سے گھٹیا حرکات اور ذلیل کارروائیوں کا وہ دور گذر گیا تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بلاشبہ قریش کی ادبین مخالف طاقت تو اب رُودررُو ہو کر میدانِ جنگ میں چیلنج کر رہی تھی، لیکن دوسری طرف مدینہ میں تحریک کی پُرزور اٹھان نے نئی مخالف طاقتیں ابھار دی تھیں اور وہ شر انگیزی میں اہلِ مکہ سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ اس شر انگیزی کے نت نئے کرشموں نے داعیٔ حق اور اس کے رفقا کو شروع سے آخر تک پریشان کیا اور تمدن کی تعمیرِ نو کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

تاریخی کلیہ یہی ہے کہ اصلاح و تعمیر کا کام جتنا جتنا آگے بڑھتا ہے، اصلاح دشمن اور جمود پسند طاقتیں اس کو تباہ کرنے کے لیے جذباتِ عداوت میں اتنی ہی زیادہ بھڑکتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ حق جب مظلومی کے تختۂ دار

سے ایک جست لگاکر تخت اقتدار پر قدم رکھتا ہے تو باطل کا بغض و حسد بھی ساری حدوں سے آگے نکل جاتا ہے۔
یہی صورت مدینہ میں نئی مسلم سوسائٹی کے قیام اور امن و سلامتی کی ریاست کے برپا ہونے پر پیدا ہوئی۔

مدینہ کی مختلف فضا۔ تاریخی لحاظ سے یہ صورت واقعہ بجائے خود بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مدینہ کی سیاسی و مذہبی فضا مکہ سے بالکل مختلف تھی یہی وجہ تھی کہ دین حق کی جو پنیری وہاں سخت ناساز گار حالات سے دوچار تھی، یہاں لاکر جونہی نصب کی گئی تو وہ تیزی سے برگ و بار لانے لگی۔

پہلی بات یہ کہ مکہ اور اس کے ماحول کی ساری آبادی باہم وگر مربوط تھی اور مذہبی، قبیلوی اور معاہداتی بندھنوں سے بندھی ہوئی تھی اور قریش کا اس پر پورا تسلط تھا۔ لیکن مدینہ اور اس کے ماحول میں دو مختلف عناصر آباد تھے۔ جن کے درمیان ٹکراؤ موجود تھا۔

مدینہ یثرب کے نام سے یہودیوں کا آباد کردہ قدیم شہر تھا۔ یہاں جوں جوں ان کی نسل پھیلتی گئی۔ مدینہ کے آس پاس ان کی نئی بستیاں قائم ہوتی گئیں اور ساتھ کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے جنگی قلعے تعمیر ہوتے گئے۔ بنابریں پورا علاقہ یہود کے مذہبی و سیاسی تسلط میں تھا۔

دوسرا عنصر انصار کا تھا۔ ان کا اصل وطن یمن تھا۔ اور غسان کا خاندان ان کا نسلی سرچشمہ تھا۔ جس زمانے میں یمن میں سیل عرم نامی مشہور سیلاب نے تباہی مچائی تھی اور بچے کھچے لوگ ادھر اُدھر منتشر ہوئے تھے، اس زمانے میں قحطان کے قبیلے میں سے اوس اور خزرج نام کے دو بھائی یثرب آپہنچے اور یہاں آباد ہوگئے۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں اور لوگ بھی آئے ہوں تاہم انہی نوواردوں کے ذریعے اس علاقے میں نئے عنصر کا اضافہ ہوا۔ بعد میں نسل بڑھتی گئی اور آہستہ آہستہ ایک نئی طاقت ابھرنے لگی۔ شروع شروع میں ان لوگوں نے یہودی معاشرہ اور تمدن سے منقطع رہ کر پنپنا چاہا، لیکن پہلے کی جمی ہوئی طاقت کے نفوذ و اثر سے دب کر ان سے دوستانہ معاہدہ استوار کر لیا۔ معاہدانہ تعلقات دیر تک خوش اسلوبی سے چلتے رہے، لیکن یہود نے جونہی یہ محسوس کیا کہ انصار کی روزافزوں ترقی ان کے اقتدار کے لیے ایک خطرہ بنتی جارہی ہے تو انہوں نے حلیفانہ تعلق توڑ لیا۔

یہود کے اندر ایک عیاش رئیس فطیون نامی اٹھا۔ اس نے جبر و قوت سے اپنا یہ حکم نافذ کر دیا کہ اس کی

ہمودیوں میں جو لڑکی بھی بیاہی جائے وہ اس کے شبستانِ عیش سے گذر کر ازدواجی زندگی کے دائرے میں داخل ہو۔ یہود کے بگاڑ کا اس سے اندازہ کیجئے کہ انہوں نے فطیون کے اس حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس شیطانی حکم نے انصار کی غیرت کو بھی چیلنج کر دیا۔ مالک بن عجلان کی بہن کی شادی ہو رہی تھی کہ عین بارات کے دن وہ بھائی کے سامنے سے پورے انداز بے حجابی کے ساتھ گزری۔ مالک نے ملامت کی تو اس نے کہا کہ کل جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے زیادہ شدید ہے۔ چنانچہ مالک نے فطیون کو جا کر قتل کر دیا اور شام کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں غسانی حکمران ابو جبیلہ کا سکہ چل رہا تھا۔ اسے یہ حالات جب معلوم ہوئے تو اس نے حملہ کیا اور بڑے بڑے یہودیوں کو قتل کیا اور اوس و خزرج کو خلعت و انعام سے نوازا۔ ان واقعات نے یہود کا زور توڑ دیا اور انصار کی طاقت بڑھا دی۔

غرض یہود کے مقابلے میں انصار کا معاملہ برابر کی چوٹ کا معاملہ تھا۔ لیکن اصول و مقصد کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اتحاد مضبوط بنیاد نہیں رکھتا تھا۔ آپس کی کشمکش نے دیمک بن کر طاقت کو چاٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اوس و خزرج کے درمیان جنگِ بُعاث واقع ہوئی اور فریقین کے نہایت قیمتی افراد ایک دوسرے کی تلواروں کا لقمہ ہو گئے۔ اس طرح یہود کے مقابلے وہ کچھ کمزور ہو کر رہ گئے۔ اسی حالت سے مجبور ہو کر انہوں نے قریب کے زمانے میں قریش کے سامنے حلیفانہ تعلقات کی درخواست رکھی تھی، لیکن بعض وجوہ سے یہ کوشش ناکام رہی۔

دوسری طرف یہود کے تفوق کی ایک وجہ ان کی مذہبی سیادت بھی تھی۔ ان کے پاس تورات تھی اور وہ ایک مستقل مذہبی نظام کے علمبردار تھے۔ ان کے پاس ایک سرمایۂ اعتقاد تھا، ایک اخلاقی ضابطہ تھا، فقہی احکام تھے، مذہبی قانون تھا، کچھ معاملات تھیں اور عبادات کی انجام دہی کا ایک طریقہ تھا۔ انصار اس پہلو سے تہی دامن تھے اور وہ اس دائرے میں ان کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور تھے۔ انہی کے "بیت المدارس" (یہودیوں کے مذہبی تعلیم کے مراکز) سے وہ استفادہ کرتے تھے۔ حد یہ کہ اگر کسی انصاری کی اولاد زندہ نہ رہتی تھی تو وہ نذر ہی یہ مانتا تھا کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنایا جائے گا۔ انصار میں اس پہلو سے احساسِ کمتری موجود تھا اور ان کی غیرت و حمیت اس پر کرب محسوس کرتی تھی۔

اوپر کے حقائق کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مدینہ کے ماحول میں یہود اور انصار کے درمیان کھچاؤ تھا اور تعلقات کی گہرائی میں حریفانہ و رقیبانہ جذبات کام کر رہے تھے۔

اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہود انصار کے سامنے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ آخری نبی جلد ہی مبعوث ہونے والا ہے، وہ آئے تو پھر ہم اس کے ساتھ ہو کر تمہاری خبر لیں گے۔ یہود کی اس پیشگوئی نے انصار کو بھی اس پیغمبرِ موعود کا منتظر بنا دیا تھا اور ان کے اندر ایک غیر شعوری رجحان یہ کام کر رہا تھا کہ اگر وہ نبی آجائے تو وہ آگے بڑھ کے اس کا دامن تھام لیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ پیشگوئی سنانے والے خود تو محروم رہے اور جن کو وہ دھمکیاں دیا کرتے تھے وہ نبی آخر الزماں کے حلقۂ رفاقت میں آگئے۔ یہود جن کو پٹوانا چاہتے تھے ان کے ہاتھوں سے خود پٹ گئے۔[1]

مدینہ کی اس فضا اور اس کے پس منظر کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیوں یہ ماحول مکہ کے مقابلے میں تحریکِ اسلامی کو زیادہ راس آیا۔

تحریکِ اسلامی مدینہ میں | مکہ نے دعوتِ حق سنی اور مسلسل ۱۳ سال سنی، اس کا پورا استدلال سامنے آیا، اس کے نور سے بھری ہوئی ایک لا مثال شخصیت کا کردار اس کے سامنے جگمگاتا رہا، اس کے علمبرداروں نے ظلم کی چکی میں پستے ہوئے "احد، احد" کی صدا بلند کی، مگر مکہ کی اجتماعی فضا نے شروع سے آخر تک ایک ہی رٹ لگائے رکھی ــــ "نہیں منظور!"

لیکن مدینہ تک گلِ دعوت کی نکہت کا پہلا جھونکا ہی پہنچا ہو گا کہ اس کی روح وجد میں آکر پکار اٹھی "لبیک"

مدینہ کا پہلا نوجوان جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے بہرہ اندوز ہوا سُوید بن صامت تھا۔ یہ ایک ذہین شاعر تھا، ایک ماہر سوار تھا، بہادر جنگجو تھا۔ ایسے نوجوان بالعموم انقلابی حرکت کے سپاہی بنا کرتے ہیں اور تعمیر و ترقی کی ہر دعوت پر لبیک کہتے اور پھر اپنا سب کچھ لگا دیا کرتے ہیں۔ یہ نوجوان مکہ آیا تو سرورِ عالم نے حسبِ معمول مل کر دعوت پیش کی۔ سُوید نے بتایا کہ ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے، یعنی صحیفۂ لقمان! اس کا کچھ حصہ اس نے سنایا بھی۔ پھر آنحضور صلعم نے قرآن سنایا۔ دیکھئے بے تعصبی کا مظاہرہ، سُوید کی فطرتِ سلیم

---

[1] یہ معلومات سیرت النبی از علامہ شبلی مرحوم (حصہ اول) سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو: صہ ۱۸۹ تا صہ ۱۹۱۔

تو پکار اٹھی کہ "ان ھٰذا القول حسن" یعنی یہ کلام خوبی میں بڑھا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کلام کا پیغام اس کے دل میں گھر کر گیا۔ لیکن افسوس کہ جانے کے بعد جلد ہی وہ خزرجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں بعد میں لوگوں نے تذکرہ کیا کہ وہ قتل ہوتے وقت مسلم تھا اور تکبیر اس کی زبان پر تھی۔[1]

متاثر ہونے والا دوسرا یثربی نوجوان ایاس بن معاذ تھا۔ یہ مدینہ کے ایک وفد کا رکن تھا۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ خزرج کے خلاف قریش سے حلیفانہ معاہدہ کریں اور امداد حاصل کریں۔ داعیٔ حق نے ان لوگوں تک بات پہنچانے کا موقع نکالا۔ اسلام کا تعارف کرایا اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ ایاس بن معاذ جو اس وقت لڑکپن کے عالم میں تھا، کہنے لگا: "ای قوم! ھٰذا واللہ خیر مما جئتم بہ" کیا ہی پاکیزہ فطرت بول رہی ہے کہ "اے ساتھیو! تم جس غرض کے لیے آئے ہو اس سے یہ زیادہ بہتر ہے"۔ سردار وفد ابو الحیسر نے مٹی اٹھا کر اس کے منہ پر ماری، مطلب یہ تھا کہ یہ تم بیچ میں کیا غضب ڈھا رہے ہو۔ ساتھ ہی کہا "ہم اس مطلب کے لیے نہیں آئے"! ابو الحیسر کو فکر تھی قریش کی حمایت حاصل کرنے کی اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ محمد صلعم کی بات مانی تو قریش کے دلوں کے دروازے الٹا اور بند ہو جائیں گے۔ ایاس چپ ہو گیا! ——— لیکن اس کے دل کی مٹی میں دعوت کا بیج پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اور افسوس کہ مدینہ کا یہ بیدار دل بھی جلد ہی جنگ بعاث کی لپیٹ میں آ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

نبوت کے گیارھویں سال حج کے لیے مدینہ سے جو گروہ آیا اس سے ایک نشست میں سرورِ عالمؐ کی بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ آپ کی دعوت کو سن کر وہ لوگ آپس میں کہنے لگے "اے ساتھیو! جان لو کہ قطعی طور پر یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں یہود تمہارے سامنے پیشین گوئی کرتے رہتے ہیں، سو اب وہ کہیں تم سے آگے نہ بڑھ جائیں"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کھول دیئے اور انہوں نے دینِ حق کو اپنے سینوں میں جذب کر لیا۔ پھر وہ کہنے لگے:-

"ہم لوگوں نے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑا، دوسری کسی قوم میں ہمارے لوگوں کی طرح دشمنی اور خرابی نہ ہو گی شاید کہ آپ کی ذات کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کو پھر جوڑ جاڑ دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپ کے

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۶۶-۶۷ — [2] ایضاً ص ۶۹

دین کی طرف ان کو دعوت دیں گے اور ان کے سامنے اپنا وہ تاثر رکھ دیں گے جو اس دین کے لیے آپ کے سامنے ہم نے ظاہر کیا ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دین پر جمع کر دیا تو اس کے بعد آپ سے زیادہ قوت رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہوگا"

مکہ کے لوگوں نے جس دعوت کو موجب تفرقہ گردانا، مدینہ کے لوگوں نے اس میں اپنے لیے اتفاق و اتحاد کی بنیاد پہلی نظر ڈالتے ہی دیکھ لی۔ اسلامی تحریک کی علمبرداری کے لیے مدینہ کی یہ پہلی جماعت جس کی تشکیل مکہ میں ہو رہی تھی، چھ افراد پر مشتمل تھی۔ (۱) ابوالہیثم بن تیہان (۲) اسعد بن زرارہ (۳) عوف بن حارث (۴) رافع بن مالک بن عجلان (۵) قطبہ بن عامر (۶) جابر بن عبداللہ۔

یہ لوگ لوٹ کر گئے تو ماحول میں ایک نئی حرکت انہوں نے پیدا کر دی۔ دعوتِ اسلام پھیلنے لگی اور خوب مقبول ہوئی۔ انصار کے گھرانوں میں سے کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا نہ ہو رہا ہو۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ اگلے سال یعنی نبوت کے بارھویں برس بارہ افراد کا وفد آیا اور آکر بیعت کی۔ اس بیعت کو اصطلاحاً بیعت النساء یعنی زنانہ بیعت کہتے ہیں۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ اس بیعت میں صرف بنیادی باتوں کا اقرار لیا گیا تھا اور جنگ و تصادم کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ اس ایمانی اقرار کے اجزاء یہ تھے:۔

"ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، کسی کے خلاف جانتے بوجھتے کوئی من گھڑت بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گے، اور کسی معروف معاملے میں محمد صلعم کی نافرمانی نہیں کریں گے"

یہ لوگ فارغ ہو کر اٹھے تو پیغمبرِ خدا نے مصعب ابن عمیر بن ہاشم کو مدینہ میں فریضۂ دعوت کی انجام دہی پر مامور کیا۔ ان کے ذمے لگایا کہ وہاں جا کر لوگوں کو قرآن پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں، دین کی سوجھ بوجھ پیدا کریں۔ چنانچہ وہ نماز کی امامت بھی کرتے تھے اور اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کے اصولِ اخلاق کی تعلیم بھی دیتے تھے۔[1]

دو لیڈروں کا قبولِ اسلام ایک دن اسعد بن زرارہ (جن کے مکان پر نبی اکرمؐ کے مامور کردہ داعی مصعبؓ اقامت گزین تھے) دعوتی مہم کے سلسلے میں اپنے ساتھ مصعب بن عمیر کو لے کر بنی عبدالاشہل اور بنی ظفر کے گھروں تک جانے

[1] سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۷۶-۷۳

کے لیے نکلے۔ دونوں مرق نامی کنوئیں کے متصل بنی ظفر کے احاطے میں پہنچے۔ بعض لوگ جو اسلام لا چکے تھے ان کے گرد آ جمع ہوئے۔ سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر دونوں بنی عبدالاشہل کے لیڈر تھے اور ابھی تک اپنی قوم کے مسلک مشرکانہ پر قائم تھے۔ اسعد بن زرارہ اور مصعب کے کارِ دعوت پر سعد بن معاذ جلا بھنا تو تھا ہی، جونہی دونوں صاحبوں کے ادھر آنے کی اطلاع ملی اس نے اُسید کے کان میں پھونکا کہ یہ دونوں ہم میں سے کمزور افراد کو اُلّو بنانے آتے ہیں لہٰذا جا کر ان کی خبر لو اور ان کو منع کر دو کہ ہمارے گھروں میں نہ آیا کریں۔ اگر اسعد بن زرارہ میرا خالہ زادہ اور عزیز نہ ہوتا تو تمہارے بجائے میں خود اس سے نمٹ لیتا۔ چنانچہ جونہی مدینہ کے حلقۂ اسلامی کی یہ مجلس لگی، سعد بن معاذ کی تلقین سے زیرِ اثر اُسید بن حضیر آیا اور بھالا تانے ہوئے ان دونوں داعیانِ اسلام کی طرف لپکا۔ پھر ٹھٹک کر بدزبانی کرتے ہوئے کہا کہ "تمہارے یہاں آنے کا مطلب کیا ہے؟ تم ہمارے کمزور آدمیوں کو بے وقوف بناتے ہو، اگر تمہیں اپنی جانوں کی ضرورت ہے تو ہم سے کنارہ کرو" مصعب نرمی سے کہنے لگے کہ "کیا تم ذرا بیٹھ نہیں جاتے کہ پہلے غور سے سنو، پھر اگر بات پسند آئے تو مانو، ناپسند ہو تو اس سے باز رہو" چنانچہ وہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بھالا نیچے ڈال دیا اور تحریکِ اسلامی کے دونوں داعیوں کے پاس سکون سے بیٹھ گیا۔ مصعب نے گفتگو شروع کی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مخاطب کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبولِ اسلام کا جذبہ پڑھ لیا۔ آخر اُسید کی زبان کھلی: "کیا ہی خوب ہے یہ کلام — بہت ہی پیارا!" پوچھا: "تم لوگ اسلام میں داخل ہوتے وقت کیا صورت اختیار کرتے ہو؟" دونوں نے کہا کہ جاؤ جا کر نہاؤ، پاک صاف ہو جاؤ اور اپنے کپڑے دھو ڈالو، پھر حق کی صداقت کی گواہی دو اور نماز ادا کرو۔ اُسید جو ابھی ابھی بھالا تانے کھڑا تھا اب خود اسلام کا زندگی بخش بھالا اس کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اُٹھا، نہایا دھویا اور آ کر دو رکعتیں نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر بات چھڑی اور اُسید نے کہا کہ میرے ساتھ کا ایک شخص اور ہے، اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ہو جائے تو پھر اس کے قبیلے کا کوئی آدمی سرتابی نہ کرے گا۔ میں اسی وقت اس کو بلا لیتا ہوں۔ وہ ہے سعد بن معاذ! چنانچہ وہ فوراً بھالا اٹھائے سعد کے ہاں پہنچا۔ وہاں مجلس لگی تھی۔ اس نے دیکھتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ "میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُسید کا چہرہ وہ نہیں ہے جو تم لوگوں سے اٹھ کر جاتے وقت تھا"۔ پھر سعد نے اُسید سے پوچھا: "کہو، کیا کر کے آئے؟" اُسید نے بے ساختہ جواب دیا: "میں نے دونوں سے بات کی، سو خدا کی قسم، ان کی طرف سے کسی طرح

کا اندیشہ محسوس نہیں کیا۔ اور انہیں میں نے منع کر دیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم وہی کریں گے جو تمہیں پسند ہے" ساتھ ہی ساتھ سعد بن معاذ کے جذبات کو حرکت میں لانے کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ بنی حارثہ اسعد بن زرارہ کے قتل کے درپے ہیں اور وہ لوگ یہ جانتے ہوئے اس کی جسارت کر رہے ہیں کہ اسعد تمہارا عزیز ہے اور اس طرح وہ تمہاری تحقیر کرنا چاہتے ہیں۔ سعد بن معاذ بنی حارثہ کی طرف سے ایسی حرکت کا خوف محسوس کرتے ہوئے غضبناک ہو کر لپکا۔ اور بھالا اُسید کے ہاتھ سے اُڑس لیا لیکن وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اسلام کے دونوں علمبردار سکون سے ہیں۔ سمجھ گیا کہ اُسید کا منشا اس چال سے صرف یہ ہے کہ میں براہِ راست ان کی بات سنوں۔ ان کو بُرا بھلا کہتے ہوئے وہ سامنے ٹھٹک گیا۔ اور اسعد بن زرارہ کو مخاطب کر کے کہا کہ تم لوگ ہمارے پاس آئے ہو تو ایسی بات لے کر ہمارے گھروں میں آتے ہو جس سے ہمیں نفرت ہے۔ مصعب نے نرمی کے اسی انداز سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ذرا سنبھلو، بات سنو، پسند ہو تو مانو، نہیں تو پھر ہم وہ چیز تمہارے سامنے نہیں لائیں گے جس سے تمہیں نفرت ہو۔ سعد بن معاذ کہنے لگا: "تم نے بات انصاف کی کہی" معاً وہ ٹھنڈا پڑ گیا، بھالا نیچے ڈال دیا اور بیٹھ گیا۔ سنانے والے نے حق کا پیغام سنایا اور قرآن پڑھا۔ دوبارہ وہی کیفیت پیش آئی۔ سعد بن معاذ کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبولِ اسلام کا جذبہ جھلکنے لگا۔ یہ نہ سرالیڈر بھی چند لمحوں میں اسلام کے محاذ پر کھڑا تھا۔

سعدؓ حیاتِ نو لے کر پلٹے تو اہلِ مجلس نے دُور سے دیکھتے ہی آپس میں کہا کہ چہرے کا رنگ بدلا ہُوا ہے۔ آتے ہی اُس نے یوں خطاب کیا: "اے بنی عبدالاشہل! میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" سب کہنے لگے کہ تم ہمارے سردار ہو، تمہاری رائے ہم سے پختہ ہے، خوبیوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ بابرکت ہو۔ سعد بن معاذ نے کہا "تو پھر جب تک تم لوگ خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارے مردوں اور عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام ہے!" ـــ پھر کیا تھا، پورے قبیلے کے مرد و زن میں سے کوئی ایک بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہ رہا۔

ان دو لیڈروں کے ذریعے جب تحریکِ حق کی طاقت یکایک اتنی بڑھ گئی تو دعوت کی مہم نے بھی زور پکڑا اور ایک ایک قبیلے اور ایک ایک گھر میں صبحِ اسلام کی تجلیاں بکھر گئیں[1]۔

[1] حالات کی یہ تفصیل سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۷۷-۷۸ سے لی گئی ہے۔

بیعتِ عقبۂ ثانیہ | اسی دوران میں حج کا زمانہ آگیا۔ ایکے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مکہ پہنچی۔ مدینہ کی کھیتی خوب فصل دے رہی تھی۔ یہ نئے جذبۂ دینی سے سرشار ہوکر آنے والے حجاج قریش سے بچ بچ کر راتوں کی تاریکی میں اپنے قائد محبوب سے ملے۔ اس بار پھر عہد وفا ازسرِ نو استوار کیا گیا، لیکن ابکی معاملہ "بیعت النساء" سے بہت آگے تک جا پہنچا۔ پہلی بیعت میں سیاسی پہلو صرف ایک نکتے سے نمایاں ہوتا تھا، یعنی یہ اقرار کہ "ہم محمد صلعم کے معروف احکام سے سرتابی نہیں کریں گے۔" لیکن اس مرتبہ سیاسی پہلو پوری خطرناکیوں کے ساتھ سامنے آگیا تھا۔ اب محمد صلعم کا ساتھ دینے کے معنی قریش اور سارے عرب کے ساتھ برسرِپیکار ہونے کے تھے۔ اور یہی معنی سامنے رکھ کر بیعتِ ثانیہ استوار کی گئی۔ گفتگو میں تحریکِ اسلامی کے ان یثربی سپاہیوں نے پیش آئند ممکنات کا پورا اندازہ کرکے یہ کہا کہ "لوگوں (یعنی یہود) کے ساتھ ہمارے معاہدانہ روابط ہیں اور ہمیں ان روابط کو توڑنا ہوگا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم یہ کر چکیں اور پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا کردے تو آپ اپنے خاندان والوں کی طرف لوٹ جائیں اور ہمیں چھوڑ دیں۔" اس اندیشے کے جواب میں مسکراتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا: "تمہارا خون، میرا خون ہے، تمہارے دشمن میرے دشمن، میں تمہارا اور تم میرے! جس سے تمہاری جنگ اس سے میری جنگ، جس سے تمہاری صلح اس سے میری صلح۔" عباس بن عبادہ نے کہا: "اے خزرج والو! جانتے ہو کہ اس ہستی کے ساتھ کس بات کا پیمان باندھ رہے ہو؟ ــــ یہ لوگوں میں سے سرخ و سیاہ سے جنگ کا پیمان ہے۔" اہلِ وفد نے پوری ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا کہ "ہاں ہم اپنے مالوں کی تباہی، اپنے سرداروں کے قتل کے علی الرغم آپؐ کے ساتھ پیمان باندھ رہے ہیں۔" اس بیعت کی خاص نوعیت ہی کی وجہ سے اس کا نام "بیعتِ حرب" پڑ گیا۔ اس بیعت کی ایک مرکزی شرط یہ تھی کہ "ہم تنگی میں اور آسانی میں، خوشی میں اور رنج میں (آنحضور صلعم کا) ہر ارشاد سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے اور حضورؐ کو اور حضورؐ کے فرمان کو اپنے آپ پر ترجیح دیں گے، اور یہ کہ ہم اربابِ امر سے کشمکش نہیں کریں گے، اور یہ کہ ہم اللہ کے دین کے معاملے میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔"

یہ بیعت گویا اسلامی قصرِ ریاست کی پہلی اینٹ تھی اور ساتھ کے ساتھ کتابِ تحریک میں لکھے جانے والے بابِ ہجرت کا دیباچہ! اس بیعت کے ذریعے مستقبل کی اسلامی ریاست کے لیے گویا اس کے ہونے والے

شہریوں نے برضا و رغبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو قبول کر لیا۔ علاوہ بریں سمع و طاعت کا نظم استوار ہو گیا۔ اس موقع پر صرف ایک پیمان ہی نہیں باندھا گیا بلکہ اجتماعی نظم کی بنیاد بھی اٹھا دی گئی۔ اسلامی تحریک کے قافلہ سالار نے شہری جماعت کی رائے سے بارہ نقیب مقرر کیے۔ نو خزرج میں سے، تین اوس میں سے! ان نقیبوں کو مامور کیا گیا کہ تم اپنی قوم کے سارے معاملات کے ذمہ دار ہو، بالکل اسی طرح جیسے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے حواری ذمہ دار تھے اور جیسے خود میں اپنی پوری جماعت کا ذمہ دار ہوں۔ یہ گویا آنحضورؐ کے نائب تھے ان کے تقرر سے منظم معاشرہ کی تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔

قریش کے کان میں بھنک پڑی تو سٹپٹا گئے۔ وفد جا چکا تھا، اس لیے تعاقب کیا اور سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو کو گرفتار کر لائے۔ ان پر انہوں نے اپنا غصہ نکالا لیکن سانپ نکل گیا تھا، اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل تھا؟[۱]

مدینہ میں تحریک کا نیا مد و جزر | یہ طاقت مکہ سے نئی اسپرٹ لے کر مدینہ پلٹی تو دعوت کا کام علی الاعلان بہت ہی زور شور سے شروع ہو گیا۔ نوجوان جب کسی تبدیلی کے نقیب بن کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے مقابلے میں بڑھاپے سے گزرتی ہوئی نسل دیر تک جم نہیں سکتی اور جمے بھی تو اس کا دور زیادہ لمبا نہیں ہو سکتا۔ اور کسی تحریک کے مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے یہ جاننا بہت مفید ہوتا ہے کہ وہ میدان چھوڑتی ہوئی سالخوردہ نسل کے بل بوتے پر چل رہی ہے یا اس کی رگوں میں نیا خون رواں ہے۔ سو مکہ میں بھی، اور خاص طور پر مدینہ میں نوجوان طاقت دعوتِ اسلامی کے جھنڈے اٹھائے آگے آگے بڑھ رہی تھی۔

نوجوان طاقت نے کیا کیا کچھ نہ کیا ہو گا، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بڑے بوڑھوں میں سے ایک بزرگ تھے عمرو بن الجموح جن کا تعلق بنی سلمہ سے تھا۔ ان بڑے میاں نے اپنے گھر میں لکڑی کا ایک بت مناۃ نامی فراہم کر رکھا تھا۔ یہ اس کی پوجا کرتے تھے اور اس کی جھاڑ پونچھ میں لگے رہتے تھے۔ بنی سلمہ کے دو نوجوان معاذ بن جبل اور معاذ بن عمرو دعوتِ حق پر ایمان لا کر تحریکِ اسلامی

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۹۴-۸۱

کے کارکن بن چکے تھے۔ معوذ اللہ خود انہی بڑے میاں کے صاحب زادے تھے۔ یہ دونوں رات کی تاریکی میں جاتے اور بڑے میاں کے خداوند کو کیچڑ میں لت پت کر دیتے اور اٹھا کر بنی سلمہ کے گڑھے میں الٹا کر کے ڈال آتے جہاں لوگ غلاظت اور کوڑا پھینکتے تھے۔ صبح ہوتی تو عمرو بن الجموح چلاتا کہ "یہ کون ہے جس نے رات ہمارے خداوند پر دراز دستی کی ہے" پھر وہ اپنے خدائے گم شدہ کو ڈھونڈتا پھرتا اور جب پا لیتا تو اسے دھو دھا کر سنگھاسن پر لا بٹھاتا۔ اگلی رات پھر یہی حادثہ پیش آتا۔ بڑے میاں پھر اسی چکر میں پڑے بڑبڑاتے پھرتے۔ ایک دن عمرو نے تنگ آ کر اپنی تلوار بت کے ساتھ لٹکا دی اور اسے خطاب کر کے کہا کہ "خدا کی قسم، میں نہیں جانتا کہ کون تیرے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے، سو اگر تجھ میں کس بل ہے تو پھر خود ہی اپنا بچاؤ کر، یہ تلوار موجود ہے" شام ہوتی اور عمرو سو گیا تو اس ڈرامے کے دونوں کردار رات کو آئے اور تلوار بت کی گردن سے کھول لی۔ پھر ایک مرا ہوا کتا تلاش کر کے اس کے گلے میں رسی سے باندھا اور اسے ایک اندھے کنوئیں میں جا کر ڈال آئے جو انسانی غلاظت سے اٹا رہتا تھا۔ صبح اٹھ کر عمرو نے دیکھا تو حضرت پھر غائب تھے۔ تلاش کی تو یہ حالِ زار دیکھا۔ عبرت کا یہ نقشہ دیکھتے ہی دل نے کروٹ لی اور وہی عمرو اسلام کی صفوں میں آ شریک ہوا۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ کی کس طرح کایا پلٹ رہی تھی۔

اسلام اور ہمارا قانونی نظام

عبدالقادر عودہ شہیدؒ

(۲)

اسلام کی راہ میں رکاوٹیں گزشتہ مباحث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہماری اجتماعی زندگی تناقض، تصادم، انتشار اور فساد سے لبریز ہو چکی ہے اور گوناگوں مصائب و مشکلات نے ہمارے معاشرے کا گلا بری طرح دبوچ لیا ہے۔ ہر مسلمان کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے جملہ امراض کا علاج اور سارے دکھوں کا مداوا اسلام ہے۔ مسلمان صرف اس حقیقت کے اعتراف ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اس بات کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں کہ ان کی حیاتِ اجتماعیہ کو اسلام کے احکام و قوانین کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس علم و اعتراف اور اس مطالبے کے باوجود ہم اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہو رہے ہیں اور کوئی شے ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے درمیان برابر حائل ہو رہی ہے۔ اگر مسلمان بلادِ اسلامیہ کے اندر اقلیت میں ہوتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ غیر مسلم اکثریت طالب اور مطلوب کے مابین حائل ہے لیکن امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ مسلمان اپنے بیشتر ممالک میں غالب اکثریت کے مالک ہیں ان میں سے بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کا سرکاری دین بھی اسلام ہے۔ پھر یہ ممالک جمہوریت کے بھی مدعی ہیں اور ان کے دساتیر میں اس مفہوم کی واضح دفعات بھی موجود ہیں کہ یہاں حکومت اور قوانین کی تشکیل جمہور یعنی اہلِ ملک کی اکثریت کے حسب منشا عمل میں لائی جائے گی۔ پھر اسلام کی راہ میں آخر رکاوٹ کیا ہے؟ اگر آپ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس راہ میں بڑی رکاوٹیں صرف دو ہیں: ایک مغربی استعمار، دوسری مسلمانوں کی اپنی حکومتیں۔

استعمار سامراج اور استعمار، اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ اسی نے سب سے پہلے اسلامی قوانین کی تنسیخ اور ان کی جگہ پر غیر اسلامی قوانین کی ترویج کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ اسلامی قوانین کے بل پر ایک مکمل اسلامی معاشرہ جہاں وجود میں آجاتے وہاں مغربی استعمار و استبداد اپنے قدم ہرگز نہیں جما سکتا۔ اسے لازماً راہِ فرار اختیار کرنی پڑتی ہے اسلام

مسلمانوں میں صرف اللہ کے کلمے کو بلند دیکھنا چاہتا ہے اور استعمار کی آلائشوں کو کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اسلام مسلمان کے لیے حرام قرار دیتا ہے کہ وہ کفر کے سامنے کسی لحاظ سے بھی جھکے یا اُس سے کسی حیثیت میں بھی دبے۔ اسلام نے مسلمان کو یہ سکھایا ہے کہ وہ استعمار کے خلاف ہر لحظہ سربکف اور شمشیر بدست رہے اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جس وقت تک دین اسلام کو غلبہ نصیب نہ ہو جائے: اسلام کا بول بالا اور کفر کا بول پست نہ ہو جائے۔ اسلام نے امپیریلزم سے مودت و موالات کو حرام کر دیا ہے اور اُس سے نفرت و کراہیت کو واجب قرار دیا ہے۔ اب آپ خود غور کر سکتے ہیں کہ سامراج اسلامی فضا میں کیسے جڑ پکڑ سکتا اور پروان چڑھ سکتا ہے اور جس فضا میں سامراج قدم جمالے وہاں اسلام کیسے باقی رہ سکتا ہے۔

اسلام روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو ایک امت قرار دیتا ہے اور اُن سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوں۔ اعدائے اسلام مسلمان ممالک میں سے ایک ایک کو تو اپنے دام تزویر کا شکار بنا سکتے ہیں لیکن ساری دنیا کی اسلامی وحدت کا مقابلہ بھلا وہ کیسے کر سکتے ہیں؟ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں اسلامی قوانین نافذ ہونے کے بجائے الگ الگ قومی اور غیر اسلامی قوانین نافذ ہوں اور ایک بین الاقوامی اسلامی قومیت نشوونما پانے کے بجائے اُن میں الگ الگ ملکی اور نسلی قومیتیں نشوونما پائیں۔ جب تک دنیا میں استعمار باقی ہے اسلام اور استعمار کی لڑائی بھی باقی ہے۔ اگر مسلمانوں میں قوت ہے تو وہ برابر اس دشمن کے خلاف سینہ سپر رہیں گے۔ اگر ان میں قوت نہیں تو وہ برابر فراہمیٔ قوت کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ وہ استعمار سے ہنگامی معاہدات اور مصالحت کر سکتے ہیں لیکن جونہی وہ مستعمرین کی طرف سے خیانت اور نقصان کا خدشہ محسوس کریں گے، وہ معاہدات کو اُن کے منہ پر دے ماریں گے اور علانیہ اُن کے خلاف جنگ آزما ہو جائیں گے۔ اسلام میں احتکار، جبری استحصال، ناجائز نفع اندوزی اور سود کی ساری شکلیں حرام ہیں اور یہی وہ اصل ستون ہیں جن کے سہارے استعمار کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگر یہ ستون ہٹا دیئے جائیں تو سامراجی محل آناً فاناً فرشِ خاک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامراج سیاسی یا اقتصادی حیثیت سے جب بھی مسلمان ممالک میں راہ پاتا ہے تو اُس کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس ملک میں اسلامی احکام و قوانین کو معطل اور منسوخ کیا جائے۔ ایک رستے سے اگر استعمار داخل ہونا شروع ہوتا ہے تو دوسرے رستے سے اسلام خارج ہونا شروع

ہو جاتا ہے۔

سامراجی ہتھکنڈے | سامراج اپنے مقصد کے حصول کے لیے اور اسلام اور مسلمانوں کے مابین حائل ہونے کے لیے عجیب غریب اور طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں کا ناصح مشفق بن کر انہیں مشورہ دیتا ہے کہ وہ اسلام کے قوانین پارینہ کو ترک کر کے مغرب کے قوانینِ جدیدہ کو اخذ کریں کیونکہ وہ قوت و ترقی اور تہذیب و شائستگی کے ضامن ہیں حالانکہ درحقیقت وہ ضعف و اضمحلال اور ہلاکت و فساد کا باعث ہیں۔ استعمار پسند مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور فراہمیِ قوت سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں، اس لیے وہ اس امر کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ جذبہ بیدار اور یہ قوت پیدا نہ ہونے پائے۔ ہمیں برطانیہ کے وزیر اعلیٰ گلیڈسٹون (GLAD STONE) کے وہ الفاظ کبھی نہیں بھولنے چاہئیں جو انہوں نے دارالعوام میں کھڑے ہو کر کہے تھے۔ وہ الفاظ یہ تھے: "برٹش امپائر کے قدم اس وقت تک اسلامی ممالک میں نہیں جم سکتے جب تک ان میں یہ کتاب موجود ہے جسے قرآن کہا جاتا ہے۔"

امپیریلسٹ طاقتیں اپنے واعظین اور مشنریوں سے بھی مدد لیتی ہیں۔ چونکہ ان طاقتوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ علانیہ اور براہِ راست مسلمانوں کو کافر بنانا اور اسلام کے ترک و انحراف پر انہیں آمادہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے اب بالواسطہ تدریج کے ساتھ مسلمانوں کو اپنے مقام رفیع سے زینہ بزینہ نیچے اتارنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مغرب کے مبلغین ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مذہب اور علم و عقل کا کوئی جوڑ نہیں ہے اور دین نے ہمیشہ علم و فن کے ارتقا کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ مسیحی چرچ کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ جب تک ان دونوں کے دائرۂ کار کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر دیا گیا اقوام یورپ ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکیں۔ وہ مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اُن کے زوال کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ دین سے غیر معمولی وابستگی رکھتے ہیں اور زندگی کے ہر معاملے میں مذہب سے رہنمائی طلب کرتے ہیں۔ اُن کے بقول جب تک دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر دیا جائے گا اور یورپ والوں کی طرح جب تک لادینی حکومتوں کا قیام عمل میں نہیں آئے گا، اُس وقت تک مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ مغربی مفکرین و واعظین کا یہ جادو بہت حد تک کام کر گیا ہے۔ ہمارے اپنے بہت سے مصنفین اور سیاسیین نے بھی اب یہی راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ذہن کو مسموم کر دیا ہے اور استعمار پرستوں اور مشنریوں کے لیے زمین کو بہت حد تک ہموار کر دیا ہے۔ ہم میں سے بہت سے نام نہاد

مسلمان ایسے ہیں جن کے ذہن، قلم اور زبان کو حقیر قیمت کے عوض خرید لیا گیا ہے۔ ان سے دین کی مخالفت کرائی جاتی ہے اور مسلمانوں میں اس بات کی تبلیغ کرائی جاتی ہے کہ وہ تمام دنیوی معاملات سے دین کو بے دخل کر دیں اور اہل مغرب کی طرح مذہب اور سیاست کے تعلق کو بالکل ختم کر دیں۔ اس طریقے سے سامراجی طاقتیں اسلام اور مسلمین کے مابین حائل ہو کر اپنی گرفت کو مضبوط کرتی ہیں۔

اسی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے سرکاری مدارس میں دینی تعلیم کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ دنیوی تعلیم میں نصاب سارے کا سارا مغرب سے مستعار لیا جاتا ہے۔ جو طلبہ ان مدارس سے سندیں لے کر نکلتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ حکومت و سیاست کے معاملات میں دین کو مداخلت کا اہل نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں دین کو دنیوی معاملات سے کوئی علاقہ نہیں ہونا چاہیے اور اسے صرف خدا اور بندے کے تعلق سے بحث کرنی چاہیے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دین کے احکام سے نجات پائے بغیر کوئی قوم ترقی کے منازل اور تہذیب کے مدارج طے ہی نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اگرچہ دین کی ابجد سے بھی ناواقف ہوتے ہیں لیکن اس جہالت کے باوجود وہ دین کے بارے میں فیصلے صادر فرمانے کی جسارت کرتے ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کی حکومت اور ان کی تعلیم و تربیت کی باگ ڈور آجکل ایسے ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی تعلیم و تربیت کی فضا میں سے خال خال ہی لوگ ایسی بیدار بینی بصیرت لے کر نکل سکتے ہیں جو اپنے گردوپیش پر تنقید، محاسبہ اور موازنہ کی نگاہ ڈالیں اور اس حقیقت کو بھانپ لیں کہ استعمار اپنا کام کس مستعدی اور صفائی سے سرانجام دے رہا ہے اور کس طرح ان لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنا رہا ہے۔

دین و سیاست کی علیحدگی اگر مسلمان یہ سمجھ بیٹھیں کہ یورپ کی "ترقی" کا راز دین و سیاست کی جدائی میں مضمر ہے تو یہ ان کی سادہ لوحی اور بے خبری کی بہت بڑی دلیل ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس مسیحیت سے یورپ آشنا رہا ہے اس میں حکومت، سیاست اور دوسرے اجتماعی معاملات سے متعلق احکام و ضوابط سرے سے تھے ہی نہیں کہ مذہب کو سیاست سے جوڑنے یا توڑنے کا سوال پیدا ہوتا۔ مسیحیت کو عروج اس وقت نصیب ہوا ہے جب رومن امپائر نے اس کی سرپرستی کو قبول کیا اور اسے سرکاری مذہب قرار دے کر اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس وقت اس سلطنت کا اپنا ایک مکمل قانون موجود تھا جسے آج تک "رومن لا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عیسائیت کے سرکاری مذہب قرار دیئے جانے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اس سلطنت کا قانون یہی رومی

قانون تھا۔ اور اس وقت جبکہ یورپ کی بیشتر ریاستیں اپنے آپ کو سیکولر ریاست کہلانا پسند کرتی ہیں، ان کے قوانین کی اساس اسی رومی قانون ہی پر رکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسیحیت میں نہ تو ریاست کی رہنمائی کے لیے کوئی قانونی ضوابط کا سرمایہ موجود تھا اور نہ ہی اُسے ریاست کے قوانین میں مداخلت کا کوئی خاص موقع مل سکا۔ البتہ عیسائیت کے سرکاری مذہب ہو جانے کا اتنا نتیجہ ضرور نکلا کہ اس کی بعض اخلاقی ہدایات کا اثر قانون سازی پر مترتب ہوا۔ لیکن اس کے بعد ایک افسوسناک صورتِ حال رونما ہوئی اور وہ یہ کہ اربابِ کلیسا نے اربابِ حکومت سے ایک ناپاک سازش اور خفیہ گٹھ جوڑ کر لی اور خدایانِ کلیسا تختِ سلطنت پر متمکن ہو گئے۔ شریعت کے احکام تو اُن کے ہاں تھے ہی نہیں۔ انہوں نے اپنی عقل کے بل پر، بلکہ اٹکل پچو اور نفسانیت کی بنا پر کچھ اصول و ضوابط گھڑ لیے اور انہیں مذہب اور خدا کے نام پر لوگوں کے سر منڈھنا شروع کر دیا تاکہ عوام کو اپنی خواہشات کا غلام بنا کر رکھیں۔ کچھ عرصے تک یہ صورتِ حال قائم رہی لیکن بعد میں سیاست اور فکر و نظر کے میدان میں ان مذہبی اجارہ داروں کے رقیب پیدا ہو گئے۔ غلبہ و اقتدار کے حصول کی خاطر ان دونوں گروہوں میں شدید اور خونریز کشمکش برپا رہی جس میں آخر کار خدایانِ کلیسا کو شکستِ فاش نصیب ہوئی اور ان کے مخالفین سیاست و سیادت کے مقام پر فائز ہو گئے۔

درحقیقت یہ لڑائی دین و الحاد کی لڑائی نہیں تھی اور نہ ہی بنائے نزاع یہ اصول تھا کہ ریاست و سیاست کا دین سے تعلق ہو یا نہ ہو۔ حقیقت میں یہ ایک جنگِ اقتدار تھی جو خالص ہوائے نفس کی بنیاد پر لڑی جا رہی تھی۔ دین و مذہب سے اسے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ایک طرف کلیسا کے ٹھیکیدار تھے جو "مذہب" کے نام پر فریب کاری کر رہے تھے، دوسری طرف عام سیاست باز تھے جو قوم کے عوام اور "جمہور" کے نام پر اپنا سکہ چلانا چاہتے تھے۔ یہ اصولوں کی جنگ نہیں تھی بلکہ افراد و ذاتیات کی جنگ تھی جو پورے بے اصولے پن کے ساتھ لڑی جا رہی تھی۔ ریاست اور اُس کے قانون کی دین سے جتنی کچھ وابستگی یا علیحدگی پہلے تھی وہ کم و بیش اب بھی موجود ہے۔ اگر آپ گزشتہ چند صدیوں کے یورپین قوانین کا مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ ان میں کوئی بنیادی اور اہم تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے سوائے اس کے کہ پہلے حاکمیت "چرچ" کے نام پر مندرج تھی اور اب "جمہور" کے نام درج ہے۔ وہی حال رہی ہے کہ پہلے بھی چند انسان اپنے ظن و تخمین کی بنا پر قانون سازی کرتے

تھے اسباب بھی چند انسان اپنے گمان و قیاس کے بل پر قانون بنا رہے ہیں۔ قانون کی بنیاد بھی وہی مدون لا ہے اس میں صرف اتنی تبدیلی ہوئی ہے جتنی مختلف حالات و ادوار میں ناگزیر سمجھی گئی ہے۔

تاریخی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو کلیسا اور اس کے مخالفین کے مابین جو کشمکش برپا ہوئی ہے اس سے دو نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک خاص گروہ کے سیاسی اقتدار کو مذہب کی حمایت حاصل نہیں ہے اور اس کا امکان باقی نہیں رہا کہ ایک خاص طبقہ مذہب کے نام سے ہمیشہ حکومت پر قابض یا غالب رہے۔ دوسرے یہ کہ اب خیال و عقیدہ کی آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ اہل کلیسا لوگوں سے ایک خاص عقیدہ بجبر منواتے تھے اور جو نہیں مانتا تھا اسے انواع و اقسام کی اذیتوں میں مبتلا کرتے تھے۔ یہ دونوں نتائج اپنی جگہ پر بہت مفید ہیں اور ان دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے حصول کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اب دین اور سیاست میں کوئی رشتہ باقی نہیں ہے یا اس رشتے کو اب ختم کیا جانا چاہیے۔ دین پر قانون کی بنا رکھنے کا بھی یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ سیاست و حکومت پر کسی خاص طبقے کی اجارہ داری قائم کی جائے یا لوگوں کو کسی خاص عقیدے کا زبردستی پیرو بنایا جائے۔ کم از کم اسلام میں ایسی صورت پیدا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں علماء و فقہاء کا کوئی نسلی یا پیشہ ور گروہ نہیں ہے۔ ہر مسلمان عالم اور فقیہ بن سکتا ہے اور اسلام کا اس سے مطالبہ ہی یہی ہے کہ وہ عالم اور فقیہ بنے اور جاہل نہ بنے۔ اسلام کے قوانین و احکام کے لحاظ سے بھی علماء و فقہاء کو کوئی ایسے پیدائشی حقوق نہیں دیئے گئے ہیں جن سے دوسرے مسلمانوں کو محروم کر دیا گیا ہو۔ اسی طرح اسلام میں عقیدہ و خیال کی بھی پوری آزادی ہے اور لوگوں سے زبردستی کوئی عقیدہ تسلیم کرانا قطعاً ممنوع ہے۔ قرآن میں صاف آیا ہے کہ لا اکراہ فی الدین، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمایا ہے کہ "اُمرنا بتدکھم وما یدینون" (ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگوں کو اپنے دین پر چلنے کے لیے چھوڑ دیں)۔

بلادِ اسلامیہ اور بلادِ یورپ

مسلمان ممالک کا حال یورپین ممالک سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارا دین مسیحیت کی مانند نہیں ہے۔ ہمارے دین میں جس طرح زندگی کے ہر معاملے سے متعلق واضح اور قطعی احکام موجود ہیں، اسی طرح سیاست و حکومت کے بارے میں بھی بالکل صاف اور صریح احکام موجود ہیں۔ اس وجہ سے اس امر کا ہرگز خدشہ نہیں ہے کہ اگر قوانین کی بنا دین پر ہو تو حکمران یا علماء من گھڑت قوانین کو خدا اور مذہب کے نام پر

پیش کر دیں گے۔ اسلامی قوانین پر مبنی حکومتوں کی کارفرمائی ہمارے ہاں صدیوں تک رہی ہے، ان میں اسلامی ہدایات سے انحراف بھی ہوا ہے مگر انحراف کو ہمیشہ انحراف سمجھا گیا ہے۔ اُسے مذہبی تقدیس کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام میں سیاست و حکومت سے متعلق احکام و ہدایات اسلامی تعلیمات کا ایک اہم اور لاینفک جزو ہیں۔ اگر انہیں ترک کر کے ان کی جگہ پر غیر اسلامی قوانین کو رائج کیا جائے تو یہ دین سے صریح خروج اور بغاوت کے مترادف ہے۔ عیسائیوں نے جب مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا اعلان کیا تھا، عملاً انہیں اپنے قوانین میں تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑی تھی کیونکہ عیسائیت کا دامن قانون و شریعت سے پہلے ہی تہی تھا اور رومی قوانین کو پہلے ہی بالادستی حاصل تھی۔ بہرحال نہ ہی اس معاملے میں اسلام کو مسیحیت پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس معاملے میں مسلمانوں کی تاریخ، اور یورپ کی تاریخ میں کسی طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے۔

دین موجب زوال نہیں ہے استعمار پرست اور ان کے شاگردانِ رشید ہمارے ممالک میں یہ تبلیغ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا باعث اتباعِ دین ہے۔ لیکن اکثر مغربی ممالک خود اب تک مذہب کے پابند ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی حکومتیں اور ان کے عوام کروڑوں پاؤنڈ عیسائیت کی تبلیغ پر خرچ کر رہے ہیں۔ اگر مذہب کی پابندی موجب زوال ہے تو یہ ممالک اپنے مذہب کو خیرباد کیوں نہیں کہتے اور دوسروں میں اس کی تبلیغ سے کیوں باز نہیں آتے۔ کسی اور مذہب کی پیروی زوال کا باعث ہو یا نہ ہو، اسلام کی پیروی تو انسان کو عروج و ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے والی ہے۔ اسلام نے مسلمان پر واجب ٹھہرایا ہے کہ وہ قوت، عزت، تفوق اور قیادت کے اسباب و وسائل فراہم کرے۔ اُس نے حکم دیا ہے کہ مسلمان خیر کا داعی بنے اور بھلائی کے سارے کاموں میں دوسروں سے تعاون کرے۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ساری انسانی برادری کو مساوات و اخوت اور عدل کی بنیادوں پر منظم کرے اور اُسے خوف، جہل، ضعف اور فقر سے نجات دلائے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ دنیا سے ظلم، جبر و استبداد، استکبار اور ناجائز استحصال و انتفاع کو مٹائے۔ اللہ نے جس شکل میں اسلام کو نازل فرمایا ہے اگر اُسے اسی کامل و جامع شکل میں نافذ کر دیا جائے تو نوعِ بشری کے جملہ مصائب و آلام کا خاتمہ ہو جائے اور دنیا کی ہر مشکل آسان ہو جائے۔

اسلام اور استعمار کی آویزش اسلام اور استعمار اپنی فطرت و طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ چنانچہ حال یہ ہے کہ اسلام سے استعمار اس حد تک خائف و ہراساں رہتا ہے کہ اسلام کی آمد کے تصور سے

دین کا چین اور راتوں کی نیند استعمار کے حق میں حرام ہو جاتی ہے۔ سیاسی پارٹیوں کا انبوہ کثیر دیکھ کر سامراج کے ماتھے پر بل تک نہیں پڑتا لیکن ایک مٹھی بھر اسلامی جماعت کا وجود اسے انگاروں پر لوٹا دیتا ہے۔ سامراج جانتا ہے کہ عام سیاسی جماعتیں مادی اور دنیوی مقاصد کی طالب ہیں اس لیے انہیں راضی اور مطمئن کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن حقیقی مسلمان رضائے الٰہی اور شہادت فی سبیل اللہ کا طالب و متلاشی ہے ایسے مسلمان کو اپنے مطلوب کی تلاش سے غافل کرنا اور کسی متاعِ دنیا پر اسے قانع اور مطمئن کر دینا آسان نہیں ہے۔ مسلمان ممالک میں جب جہاد و قتال اور شہادت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو مغربی طاقتیں مسلمان حکمرانوں سے ساز باز کرتی ہیں اور ان سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ اسلام کے داعیوں پر تشدد کریں اور انہیں اللہ کی راہ میں پیش قدمی کرنے سے روکیں۔ لیکن سچے مسلمان دبنے اور ہتھیار ڈالنے سے انکار اور اِبا کرتے ہیں اور یگانوں اور بیگانوں کی اس دوگونہ لڑائی کے مقابلے میں اللہ سے صبر و ثبات اور استقامت کی دعا مانگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام غافل مسلمانوں کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں، وہ برائے العین اس کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کا اصل دشمن کون ہے اور ان کی دلی ہمدردیاں اور ان کا عملی تعاون آخرکار انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کا مرنا جینا خالص اسلام کے لیے ہے۔

آخری معرکہ | اسلام اور سامراج کی کشمکش اب ایک نئے اور انتہائی نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ یورپ و امریکہ کے پرانے سامراج کے پہلو میں اب نیا سامراج جنم لے چکا ہے بلکہ پروان چڑھ چکا ہے۔ یہ روسی سامراج ہے جس کی بھیانک اور مہیب پرچھائیں اسلامی ممالک پر پڑ رہی ہیں۔ پرانے سامراج کو اس امر کا بخوبی علم ہے کہ اس یاجوج ماجوج کے بالمقابل اگر کوئی شے سدِ سکندری کا کام دے سکتی ہے تو وہ فقط اسلام ہے۔ استعمارِ قدیم اب دو بلاؤں کے درمیان گھر گیا ہے۔ اگر وہ روس کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیتا ہے تو اسے یقین ہے کہ اشتراکیت کا دیو ہر چیز کو چٹ کر جائے گا اور پرانے سامراج اور اس کے متعلقات اور باقیاتِ سیئات کا بھی قطعی صفایا ہو جائے گا۔ اگر استعمارِ قدیم اسلام کی آمد کو نہیں روکتا، تب بھی اسلام اس استعمارِ قدیم کے آثار کو بلادِ اسلام میں سے محو کر دے گا۔ پرانے سامراج کی اب کوشش یہ ہے کہ وہ کرائے کا سپاہی بنا کر مسلمانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرے اور روسی اتحاد کے مقابلے میں خدا پرستی کی دہائی دے کر مسلمانوں کو اپنے حق میں اور روس کے خلاف استعمال کرے لیکن یہ ایک خوابِ پریشاں ہے جو اللہ نے چاہا تو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

اسلام استعمارِ جدید اور استعمارِ قدیم دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھتا ہے اور دونوں کو انتہائی نفرت، غضب اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں اسلام سے تعلق رکھنے والے اور محض مسلمان ممالک پر تسلط حاصل کرنے کے لیے اور وہاں سے ایک دوسرے کو بے دخل کرنے کے لیے آپس میں لڑتے ہیں۔ آخر مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دشمن کی حمایت میں دوسرے دشمن کے خلاف لڑیں۔ البتہ اسلام کا اور مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ یا تو غیر جانبدار کی حیثیت سے انتظار کرے یا اگر لڑے تو محض اپنی حمایت و محافظت میں لڑے۔ اینگلو امریکی اور روسی بلاک کی اس آویزش کے ذریعے سے درحقیقت اللہ نے مسلمانوں کے لیے دونوں دشمنوں سے نجات پانے کا ایک موقع فراہم کیا ہے۔ یہ دراصل دو چوروں کی لڑائی ہے جو ہمارے گھر میں نقب زنی کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ہاں چوری اور نقب زنی کی راہ ہموار کریں تو ہم ایک چور کے مقابلے میں دوسرے چور کی امداد کر سکتے ہیں لیکن اگر ہم اپنا گھر بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں چوکنا ہو کر اس لڑائی کے انجام کا منتظر رہنا چاہیے اور جو فریق بھی ہماری طرف بڑھے اس سے لڑنا چاہیے۔ ایک سچے مسلمان کو کبھی بھی امپیریلسٹوں کے جال میں نہیں پھنسنا چاہیے اور جب تک وہ مسلمان ممالک میں اپنے ظلم و ستم اور اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہ آئیں، اس وقت تک ان پر قطعاً اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام اور استعمار اس وقت میدانِ کارزار میں ہیں۔ آخری معرکے کا وقت آن پہنچا ہے۔ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو یومِ موعود کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ انشاء اللہ مومنین اللہ کی نصرت و تائید سے سرفراز ہوں گے۔ سرمایہ داروں اور بالشویکوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ انجام کس کے حق میں ہے۔

رسائل و مسائل

اسلامی جمہوریت اور ملازمینِ حکومت کی حیثیت

سوال۔ اگست ۱۹۶۰ء کے "ترجمان" میں اشارات کے زیرِ عنوان آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے مجھے جزوی اختلاف ہے۔ میرے شبہات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ آپ نے جمہوریت کو قرآن و سنت کا منشاء قرار دیا ہے۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ فی زمانہ جمہوریت ایک مخصوص طرزِ حکومت کا نام ہے جس کی بنیاد عوام کی غیر محدود حاکمیت کے تصور پر قائم ہے۔ جسے ہم کسی طرح بھی کتاب و سنت کے منشاء کے مطابق قرار نہیں دے سکتے۔ آپ جمہوریت کے لفظ کو اس کے معروف معنی سے ہٹا کر استعمال کر رہے ہیں۔ آپ نے خود اسلامی طرزِ حکومت کے لیے تھیوڈیماکریسی کی اصطلاح وضع کی تھی، اب اس اصطلاح کو چھوڑ کر آپ ڈیماکریسی کی طرف کیوں رجعت کر رہے ہیں؟

۲۔ آپ کا یہ خیال کہ ملازمینِ حکومت کو سیاسیات میں دخل انداز نہ ہونا چاہیے، بالکل مبہم اور مجمل ہے۔ کیا آپ بھی سیاسیات و مذہب کی مصنوعی تقسیم کے قائل ہیں۔

۳۔ آپ کا یہ کہنا بھی تعلیماتِ اسلامی کے مطابق نہیں کہ سرکاری ملازم ہر اس ہیئتِ حاکمہ کی اطاعت قبول کریں جسے ملک کے باشندوں کی اکثریت آئینی طور پر ملک کا اقتدار سونپ دے۔ مسلمان کے لیے خواہ وہ سرکاری ملازم ہو یا عام شہری، اطاعت صرف اسی حکمران کی لازم ہے جو کتاب و سنت کا پابند ہو۔ محض آئینی حیثیت سے ملک کی مسندِ اقتدار پر متمکن ہو جانا کسی طرح بھی مسلمانوں سے اطاعت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

جواب۔ جمہوریت کے متعلق میں بارہا اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ بات اچھی طرح واضح کر چکا ہوں کہ اسلام میں جمہوریت کا اصل جوہر موجود ہے مگر جمہوریت کے اسلامی تصور اور جمہوریت کے مغربی تصورات

میں بڑا فرق ہے۔ اسلام عوام کی لامحدود حاکمیت کا قائل نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی حاکمیت کے تحت عمومی خلافت کا قائل ہے۔ اس عمومی خلافت کے اختیارات چونکہ کسی شخص یا خاندان یا گروہ میں مرکوز نہیں ہوتے بلکہ بحیثیت مجموعی پوری ملت کو حاصل ہوتے ہیں اور وہی اس کی مجاز ہے کہ جس کو چاہے ان اختیارات کے استعمال کے لیے منتخب کرے، اس لیے شخصی اور گروہی حکومت سے ممتاز کرنے کے لیے اسلام کے طرزِ حکومت کو جمہوری حکومت کہا جاسکتا ہے۔ یہی اسلام کا مخصوص تصورِ جمہوریت ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کا ایک ہی معروف اور متفق علیہ تصور رائج ہے۔ مغرب میں بھی جمہوریت کے مختلف تصورات، مثلاً سرمایہ دارانہ جمہوریت، اشتراکی جمہوریت وغیرہ موجود ہیں۔ ان کے بالمقابل اسلامی طرزِ حکومت کو اسلامی جمہوریت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسی اسلامی جمہوریت کو میں نے تھیوڈیماکریسی کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس اصطلاح سے بھی مراد جمہوریت ہی کی ایک قسم ہے جو اسلامی اصولوں پر مبنی ہے۔

ملازمین حکومت کے سیاسیات میں دخل انداز ہونے کی جو مخالفت میں نے کی ہے اس کے وجوہ و دلائل بھی میں نے بیان کر دیے ہیں۔ آپ نے ان دلائل پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی اور ایسے پہلوؤں سے اعتراضات شروع کر دیے جو اصل معاملہ سے غیر متعلق ہیں۔ ملازمین حکومت کی ایک حیثیت ذاتی ہے اور دوسری حیثیت ملازم حکومت ہونے کی ہے۔ ذاتی حیثیت میں کوئی بھی نہیں کہتا کہ وہ سیاست سے علیحدہ رہیں۔ سیاسی ووٹ تو ان کو بھی عام لوگوں کی طرح ووٹ کا حق حاصل ہے۔ لیکن ملازم حکومت ہونے کی حیثیت سے ان کا سیاست میں دخل انداز ہونا اور ان سرکاری اختیارات کو، جو انتظام ملک کے لیے انہیں دیے گئے ہیں، سیاسی نظریوں اور پارٹیوں میں سے کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف استعمال کرنا، اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی ملک کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ کیا آپ اسے صحیح سمجھتے ہیں کہ پولیس اور فوج اور سول سیکریٹریٹ کے لوگ اپنی جتھہ بندی کر کے خود اپنا ایک نظریہ قائم کر لیں اور یہ فیصلہ کر بیٹھیں کہ وہ خود ملک پر قبضہ کر کے اپنے نظریے کو زبردستی نافذ کریں گے یا کوئی ایسی پارٹی اگر انتخابات کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آجائے جو ان کے نظریہ سے مختلف نظریہ رکھتی ہو تو اس کی حکومت نہ چلنے دیں؟

یہ صحیح ہے کہ ایک سرکاری ملازم کو، ایک عام شہری کی طرح، صرف اسی حکمران کی اطاعت کرنی چاہیے

جو کتاب و سنت کا پابند ہو، لیکن کیا یہ بھی صحیح ہے کہ اگر کوئی حکمران کتاب و سنت کا پابند نہ ہو تو اس کی ملازمت تو کی جائے مگر اطاعت نہ کی جائے؟ میں نے تو جس سیاق و سباق میں یہ بات کہی تھی کہ باشندوں کی اکثریت جس ہیئت حاکمہ کے سپرد اختیارات کرے اس کی اطاعت ملازمین کو کرنی چاہیے، اس میں جمہوری اصول بیان کرنے سے پہلے اسلامی دستور کے اصول بھی بیان کر چکا تھا اور میری یہ بات اسی سیاق و سباق سے متعلق سمجھی جانی چاہیے تھی۔ لیکن اگر آپ اس سیاق و سباق سے الگ کر کے بھی اسے یوں لینا چاہیں تو میں کہوں گا کہ ملک کی اکثریت اگر کسی ایسی ہیئت حاکمہ کو اختیارات سونپ دے جو کتاب و سنت سے منحرف ہو تو ایک دیندار ملازم حکومت کو استعفاء دے دینا چاہیے۔ بہر حال اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ملازمت تو کرتا رہے مگر اطاعت سے انکار کر دے۔

ناقابلِ توجیہ حوادثِ حیات

سوال:۔ انسانی زندگی میں بہت سے واقعات و حوادث ایسے رونما ہوتے رہتے ہیں کہ جن میں تخریب و فساد کا پہلو تعمیر و اصلاح کے پہلو پر غالب نظر آتا ہے۔ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی حکمت و مصلحت سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر زندگی کا یہ تصور ہو کہ یہ خود بخود کہیں سے وجود میں آگئی ہے اور اس کے پیچھے کوئی حکیم، خبیر اور رحیم ہستی کارفرما نہیں ہے، تب تو زندگی کی ہر پریشانی اور الجھن اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ اس کو پیدا کرنے میں کسی عقلی وجوہ کو دخل نہیں ہے، لیکن مذہب اور خدا کے بنیادی تصورات اور ان واقعات میں کوئی مطابقت نہیں معلوم ہوتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان مسائل کے حل کرنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں، تو یہ چیز بھی عجیب ہے کہ ذہن انسانی کو ان سوالات کی پیدائش کے قابل تو بنا دیا جائے۔ لیکن ان کا جواب دینے یا سمجھنے کے قابل نہ بنایا جائے، اور سب ضروریات کا خیال رکھا جائے مگر ان ذہنی ضروریات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس طرح تو خالق کی پالیسی میں بظاہر جھول معلوم ہوتا ہے (نعوذ باللہ)

جواب - آپ جن الجھنوں میں پڑے ہوئے ہیں ان کے متعلق میرا اندازہ یہ ہے کہ میں ان کو سلجھانے کی اہلیت نہیں رکھتا - زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک آپ کی فکر کا نقطۂ آغاز صحیح نہیں ہے - آپ جن سوالات سے غور و فکر کا آغاز کرتے ہیں وہ بہرحال کُلّی سوالات نہیں ہیں، بلکہ کُل کے بعض پہلوؤں سے متعلق ہیں اور بعض سے کُل کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی - آپ پہلے کُل کے متعلق سوچیے کہ آیا یہ بغیر کسی خالق اور ناظم اور مدبر کے موجود ہو سکتا ہے یا نہیں - اگر خلق بے خالق اور نظم بے ناظم کے وجود پر آپ کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے تو باقی سب سوالات غیر ضروری ہیں، کیونکہ جس طرح سب کچھ اَلل ٹپ بن گیا اسی طرح سب کچھ اَلل ٹپ چل بھی رہا ہے - اس میں کسی حکمت، مصلحت، اور رحمت و ربوبیت کا کیا سوال - لیکن اگر اس چیز پر آپ کا دل مطمئن نہیں ہوتا تو پھر کُل کے جتنے پہلو بھی آپ کے سامنے ہیں ان سب پر بحیثیت مجموعی غور کر کے یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ ان اشیاء کی پیدائش، ان کا وجود، ان کے حالات اور ان کے اوصاف میں ان کے خالق و مدبر کی کن صفات کے آثار و شواہد نظر آتے ہیں - کیا وہ غیر حکیم ہو سکتا ہے؟ کیا وہ بے علم و بے خبر ہو سکتا ہے؟ کیا وہ بے مصلحت اور بے مقصد اندھا دھند کام کرنے والا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ بے رحم اور ظالم اور تخریب پسند ہو سکتا ہے؟ اس کے کام اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ بنانے والا ہے یا اس بات کی کہ وہ بگاڑنے والا ہے؟ اس کی بنائی ہوئی کائنات میں صلاح اور خیر اور تعمیر کا پہلو غالب ہے یا فساد اور شر اور خرابی کا پہلو؟ ان امور پر کسی سے پوچھنے کے بجائے آپ خود ہی غور کیجیے اور خود رائے قائم کیجیے - اگر بحیثیت مجموعی اپنے مشاہدے میں آنے والے آثار و احوال کو دیکھ کر آپ یہ محسوس کر لیں کہ وہ حکیم و خبیر ہے، مصلحت کے لیے کام کرنے والا ہے، اور اس کے کام میں اصل تعمیر ہے نہ کہ تخریب، تو آپ کو اس بات کا جواب خود ہی مل جائے گا کہ اس نظام میں جن جزوی آثار و احوال کو دیکھ کر آپ پریشان ہو رہے ہیں وہ یہاں کیوں پائے جاتے ہیں - ساری کائنات کو جو حکمت بنا رہی ہے اس کے کام میں اگر کہیں تخریب کے پہلو پائے جاتے ہیں تو لامحالہ وہ ناگزیر ہی ہونے چاہئیں - ہر تخریب تعمیر ہی کے لیے مطلوب ہونی چاہیے - ہر جزوی فساد کُلّی صلاح ہی کے لیے مطلوب ہونا چاہیے - رہی یہ بات کہ ہم اس کی ساری مصلحتوں کو کیوں نہیں سمجھتے تو بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ہم ان کو نہیں سمجھتے - یہ بات نہ میرے

بس میں ہے اور نہ آپ کے بس میں کہ اس امر واقعی کو بدل ڈالیں۔ اب کیا محض اس لیے کہ ہم ان کو نہیں سمجھتے، یا نہیں سمجھ سکتے، ہم پر یہ جھنجلاہٹ طاری ہو جانی چاہیے کہ ہم حکیم و خبیر کے وجود ہی کا انکار کر دیں؟ آپ کا یہ استدلال کہ "یا تو ہر جزوی حادثے کی مصلحت ہماری سمجھ میں آئے، یا پھر اس کے متعلق کوئی سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہی نہ ہو، ورنہ ہم ضرور اسے خالق کی پالیسی میں جھول قرار دیں گے کیونکہ اس نے ہمیں سوال کرنے کے قابل تو بنا دیا لیکن جواب معلوم کرنے کے ذرائع عطا نہیں کیے"، میرے نزدیک استدلال کی بہ نسبت جھنجلاہٹ کی شان زیادہ رکھتا ہے۔ گویا آپ خالق کو اس بات کی سزا دینا چاہتے ہیں کہ اس نے آپ کو اپنے ہر سوال کا جواب پانے کے قابل کیوں نہ بنایا، اور وہ سزا یہ ہے کہ آپ اسے اس بات کا الزام دے دیں گے کہ تیری پالیسی میں جھول ہے۔ اچھا، یہ سزا آپ اس کو دے دیں۔ اب مجھے بتائیے کہ اس سے آپ کو کس نوعیت کا اطمینان حاصل ہوا؟ کس مسئلہ کو آپ نے حل کر لیا؟ اس جھنجلاہٹ کو اگر آپ چھوڑ دیں تو بآسانی اپنے استدلال کی کمزوری محسوس کر لیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوال کرنے کے لیے جس قابلیت کی ضرورت ہے، جواب دینے یا جواب پانے کے لیے وہ قابلیت کافی نہیں ہوتی۔ خالق نے سوچنے کی صلاحیت تو آپ کو اس لیے دی ہے کہ اس نے آپ کو "انسان" بنایا ہے اور انسان ہونے کی حیثیت سے جو مقام آپ کو دیا گیا ہے اس کے لیے یہ صلاحیت آپ کو عطا کرنا ضروری تھا۔ مگر اس صلاحیت کی بنا پر جتنے سوالات کرنے کی قدرت آپ کو حاصل ہے ان سب کا جواب پانے کی قدرت عطا کرنا اس خدمت کے لیے ضروری نہیں ہے جو مقام انسانیت پر رہتے ہوئے آپ کو انجام دینی ہے۔ آپ اس مقام پر بیٹھے بیٹھے ہر سوال کر سکتے ہیں، لیکن بہت سے سوالات ایسے ہیں جن کا جواب آپ اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک کہ مقام انسانیت سے اٹھ کر مقام الوہیت پر نہ پہنچ جائیں، اور یہ مقام بہرحال آپ کو نہیں مل سکتا۔ سوال کرنے کی صلاحیت آپ سے سلب نہیں ہوگی، کیونکہ آپ انسان بنائے گئے ہیں، پتھر یا درخت یا حیوان نہیں بنائے گئے ہیں۔ مگر ہر سوال کا جواب پانے کے ذرائع آپ کو نہیں ملیں گے، کیونکہ آپ انسان ہیں، خدا نہیں ہیں۔ اسے اگر آپ خالق کی پالیسی میں "جھول" قرار دینا چاہیں تو دے لیجیے۔

حدیث اور توہینِ صحابہؓ

سوال: بخاری (کتاب الانبیاء) میں حضرت ابن عباس کی روایت کا ایک حصہ یہ ہے: وان اناساً من اصحابی یوخذ بہم ذات الشمال فاقول اصحابی اصحابی فیقول انہم لم یزالوا مرتدین علی اعقابہم منذ فارقتہم فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیہم شہیداً ما دمت فیہم الی قولہ الحکیم۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن "میرے بعض اصحاب" کو بائیں طرف سے گرفتار کیا جائیگا تو میں کہونگا (انہیں کچھ نہ کہو) یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب ملیگا کہ تیری وفات کے بعد یہ لوگ الٹی چال چلے۔ اس کے بعد میں حضرت عیسیٰ کی طرح کہونگا کہ خداوندا! جب تک میں ان میں موجود رہا ان کے اعمال کا نگران رہا لیکن جب تو نے مجھے وفات دی تو تو ہی ان کا رقیب تھا۔

اس روایت سے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی توہین اور تحقیر مترشح ہوتی ہے۔ کیا یہ روایت صحیح ہے؟

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام میں سے کچھ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہیں مجرم کی حیثیت سے فرشتے قیامت کے دن بائیں طرف سے گرفتار کریں گے اور یہ کہ انہوں نے دنیا کی زندگی میں سرور دو عالم کی وفات کے بعد آپ کے طریقہ کو چھوڑ کر غلط روش اختیار کی، اصحاب سے مراد جناب کے صحابہؓ ہی ہیں اس کے قرائن یہ ہیں۔

۱۔ لفظ اصحاب خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جنہوں نے آپ کی زندگی میں ایمان کے ساتھ آپ کا تعاون کیا اور آپ کی رفاقت اختیار کی انہیں اصحاب کا لقب دیا گیا۔

۲۔ ایک روایت میں خود حضور صلعم نے تصریح فرمائی ہے کہ اے جماعت صحابہ! تم میرے اصحاب ہو اور جو اہل ایمان تمہارے بعد آنے والے ہیں، ہمارے اخوان ہیں۔

۳۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت، بزرگی اور منقبت کے سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان میں بھی اصحاب کا اطلاق صحابہ کرام پر ہے۔ اصحابی کالنجوم تو مشہور حدیث ہے۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احتجاج پر فرشتے جواباً عرض کریں گے کہ آپ کے جدا ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے آپ کے طریقہ کو چھوڑ دیا اور اپنی طرف سے نئے طریقے ایجاد کر لیے۔ حدیث لاتدری ما احدثوا بعدک (مشکوٰۃ) کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ جب تک آپ زندہ رہے تو یہ لوگ آپ کے وفادار ساتھی کی طرح آپ کے دین کے پیروکار رہے لیکن جوں ہی آپ نے اس عالم ناسوت کو چھوڑا تو انہوں نے پھر دین میں رخنے ڈالنے شروع کیے۔

۵- پھر آنجناب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معذرت فرمائیں گے۔

ان قرآنی الفاظ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ معاملہ حضور کے اصحاب کا ہے۔

جواب - امام بخاری نے یہ حدیث کتاب الانبیاء میں دو جگہ ابن عباس کے حوالہ سے روایت کی ہے۔ ایک باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً میں۔ دوسرے باب واذکر فی الکتاب مریم میں۔ اس کے علاوہ اسی مضمون کی متعدد احادیث انہوں نے کتاب الرقاق۔ باب فی الحوض میں انس بن مالک، سہل بن سعد، ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہیں۔ ان سب کو جمع کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) یہ معاملہ ان لوگوں سے متعلق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اصحاب کے زمرے میں شمار ہوتے تھے، مگر آپ کے بعد مرتد ہو گئے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ انھم لن یزالوا مرتدین علی اعقابھم منذ فارقتھم (یہ آپ کے جدا ہونے کے بعد الٹے پلٹ گئے تھے اور پلٹے رہے۔ یعنی مرتد ہونے کے بعد پھر انہوں نے توبہ نہ کی)۔ دوسری روایت میں ہے کہ انھم ارتدوا علی اعقابھم القھقری، ارتدوا علی ادبارھم القھقری (وہ الٹے پھر گئے تھے یعنی جس کفر سے آئے تھے اسی کی طرف واپس چلے گئے)۔

(۲) یہ معاملہ ان لوگوں سے بھی متعلق ہے جنہوں نے حضور کے عہد میں اسلام تو قبول کر لیا تھا، مگر بعد میں بری روش اختیار کر لی۔ چنانچہ متعدد روایات میں ہے کہ لاتدری ما احدثوا بعدک، اور انک لاعلم لک بما احدثوا بعدک (آپ نہیں جانتے کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کچھ کیا)۔

دونوں صورتوں میں معاملہ بعض اصحاب سے متعلق ہے نہ کہ تمام اصحاب سے۔ ظاہر ہے کہ حضور کے زمانے میں جن لاکھوں آدمیوں نے اسلام قبول کیا تھا وہ آپ کے اصحاب میں شمار ہوتے تھے مگر انہی میں سے کچھ لوگ

وہ بھی تھے جنہوں نے فتنۂ ارتداد میں حصہ لیا اور اسی حالت میں جان دی۔ اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں کچھ لوگ ایسے ہوں جنہوں نے منافقانہ اسلام قبول کیا ہو اور اپنے نفاق کو چھپائے رکھا ہو۔ اپنے اصحاب میں ایسے لوگوں کی موجودگی کا امکان فرض کر کے اگر آپ نے کچھ باتیں بطور تنبیہ ارشاد فرمائی ہوں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے اور اس سے تمام صحابہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مذکورہ بالا احادیث دراصل اسی تنبیہ کے قبیل سے ہیں اور ان کا منشا یہ بتانا ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان کی حفاظت نہ کریں گے یا کبائر میں مبتلا ہوں گے انہیں آخرت میں محض شرف صحبت خدا کی گرفت سے نہ بچا سکے گا۔

نظریہ نسخ آیت مع بقائے حکم

پر

استدراک

[رسالہ "ترجمان القرآن" بابت ماہ نومبر ۱۹۵۵ء کے عنوان "رسائل و مسائل" کے تحت آیتِ رجم اور نظریہ "نسخ آیت مع بقائے حکم" کے متعلق جو جواب تحریر کیا گیا تھا، اسے دیکھ کر ایک صاحب نے ذیل کا مکتوب روانہ فرمایا ہے، جو اُن کے حسب ارشاد شائع کیا جا رہا ہے۔]

"جواب میں جو عقلی و نقلی مواد آپ نے پیش کیا ہے وہ ایک سمجھدار اور منصف مزاج آدمی کے لیے نہایت تسلی بخش ہے۔ مگر چونکہ آپ نے دیگر اصحاب علم سے بھی اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالنے کا مطالبہ فرمایا ہے، اس لیے حسب الارشاد چند مختصر گزارشات درج ذیل ہیں۔

(۱) نسخ آیت مع بقائے حکم کا نظریہ بعض اصولیوں کی انفرادی رائے ہے نہ کہ تمام علمائے اہل سنت کا متفقہ عقیدہ۔ جیسا کہ آپ کے پیش کردہ حوالہ "روح المعانی" جلد اول ص ۳۱۵ سے ثابت ہوتا ہے یعنی "ونسخ الآیة علی ما ارتضاہ بعض الاصولیین" الخ۔ ایسی صورت میں سائل کا یہ کہنا کہ "سلف سے تعلق تک تمام علمائے اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت تو منسوخ ہے لیکن حکم ان کا باقی ہے" محض ایک دعوی بلا دلیل بلکہ غلط بیانی ہے کیونکہ بعض اصولیوں کے کسی خاص نظریہ سے کل علمائے اہل سنت کا

عقیدہ لازم نہیں آتا۔

(۲) رہی یہ بات کہ آیا بعض اصولیوں کا یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط؟ سو واضح ہو کہ یہ نظریہ عقلاً و نقلاً باطل ہے:

(ل) عقلاً تو اس لیے باطل ہے، کہ جو چیز قرآن کا جزء ہی نہ ہو اُس کو قرآنی حکم ماننا سراسر مہمل بلکہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ یہ ایسا ہی ایک بے بنیاد تخیل ہے جیسا قرآن کے چالیس پارے ہونے کا۔

(ب) نقلاً اس لیے کہ اِس نظریہ سے تنقیصِ قرآن لازم آتی ہے۔ کیونکہ ایک باقی الحکم آیت کا قرآن میں نہ پایا جانا قرآن کے ناقص اور ادھورا ہونے کو مستلزم ہے۔ حالانکہ قرآن کی تنقیص بالاتفاق کفر اور آیت "الیوم اکملت لکم دینکم" کے صریحاً خلاف ہے۔

(۳) زنا کے متعلق شریعت کا حکم اور قانون یہ ہے کہ غیر شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سو کوڑے لگائے جائیں خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان۔ اور شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کیا جائے خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ یہ ایک مشہور و اجماعی قانون ہے جو سنتِ نبوی، سنتِ خلفائے راشدین اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ بلکہ غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا قرآن سے بھی ثابت ہے کیونکہ آیت "الزانی والزانیۃ فاجلدوا" الخ میں بدلیلِ سنت قطعیہ الف لام عہد خارجی ہے۔ جس سے مراد صرف غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ ہی ہیں۔ ایسے مشہور و معروف اور اجماعی قانونِ شریعت کے مقابلے میں اوّل تو سائل کی پیش کردہ حضرت عمرؓ والی تقریر ہی درایۃً ساقط الاعتبار ہے کیونکہ حضرت عمرؓ جیسے اعلیٰ مجتہدِ شریعت کی طرف ایسے مشہور و اجماعی قانون کی خلاف ورزی کا منسوب کیا جانا ہی بعید از قیاس ہے۔ اگر بالفرض اس نسبت کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو ایک مشہور و اجماعی قانون کے مقابلے میں حضرت عمرؓ کی یہ رائے اُن کی ایک انفرادی اور اجتہادی رائے قرار پائے گی۔ جو کسی غیر نبی کے بارے میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ "المجتہد یخطی و یصیب"۔

(بقیۂ اشارات)

نوازتے رہتے ہیں جس کی طرف سے تبدیلی برپا کرنے چلنے کا کوئی اندیشہ ہو جاتا ہے۔ دراصل مدعا یہ ہے کہ حالات کی رَو کو جُوں کا توں روک کر کھڑا رکھا جائے اور مفاد و حقوق کی موجودہ ترتیب جو ان کے حق میں مفید ترین ہے اپنی اسی حالت میں ہمیشہ قائم رہے۔ اگر یہی تاثر برقرار رکھ کر آپ نے "اسلامی دستور" کا تحفہ قوم کے دامن میں ڈالا تو یقین جانیے کہ حالات اس سے کوئی خوش آئند اثر نہیں لیں گے بلکہ فضا ویسی ہی غبار آلود رہیگی جیسی پہلے سے ہے اور زندگی کا ہر بگاڑ اپنی جگہ پر اسی طرح قائم رہے گا۔

اسلامی دستور لے کر ایوان سے باہر نکلیے تو اختلاف کا نیا ظرف لے کے آئیے۔ اختلاف کے دائرے میں دلیل سے اختلاف کیجیے اور اس سے باہر تعاون کے دائرے میں سوسائٹی کے ہر مفید عنصر کا تعاون آگے بڑھ کے طلب کیجیے اور خود اپنا تعاون پیش کیجیے۔ آپ کے علاوہ جو لوگ یہاں بستے ہیں اور کام کرتے ہیں وہ بھی اپنے ساڑھے سات کروڑ بھائیوں سے اور ان کے سیاسی گھر سے محبت رکھتے ہیں، وہ بھی ان کی بھلائی چاہنے والے ہیں، اسی محبت اور خیر خواہی کے تحت وہ کسی خاص اصول، نظریئے یا پروگرام کو پیش کرتے ہیں اور اس کے مطابق تعمیری تبدیلیاں چاہتے ہیں۔ ان کے اخلاص کے دامن پر الزامات کے دھبے ڈالنے اور ان کے خلاف عناد کی ایک فضا تیار رکھنے کے بجائے ان کو ساتھ لے کر کام لینے کا ڈھب نکالیے۔ اگر آپ کو فی الواقع یہاں کوئی نیا معاشرہ تعمیر کرنا ہے اور اگر آپ کو درحقیقت اس قوم کو ایک تاریخی طاقت بنانا ہے اور اگر پیچ در پیچ مسائل سے عہدہ برآ ہونا ہے، اور خود اپنی تباہ ہوتی ہوئی ساکھ کو از سرِ نو بنانا ہے تو یہ کام بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ آپ قوم کے سارے عناصر اور ساری جماعتوں اور ساری شخصیتوں کا تعاون اس حد تک حاصل کریں جس حد تک اور جس دائرے میں وہ ممکن ہو خصوصاً اسلامی دستور کا جرس بجا کر آپ اگر کوئی نیا قدم اُٹھاتے ہیں تو پھر سامنے وہ وادیٔ پُرخار ہے کہ جس کو طے کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ اسلام کو جاننے اور سمجھنے اور اس سے وفاداری رکھنے اور اس کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والوں کو آپ کام کرنے کا موقع دیں!

حکمراں طاقت کے لیے ایک نئے دور کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے اندر یہ تبدیلی پیدا کرنا بہت ناگزیر ہے کہ وہ ساری قوم کو یہ اطمینان دلا دے کہ نظریاتی اختلاف کی خطا پر اب کسی کے خلاف نہ زبان کھولی جائے گی، اور نہ نت نئے انکشافات سامنے لائے جائیں گے۔ نہ قانون اور مستبدانہ اختیارات کا استعمال ہوگا۔ اس صورت میں انصاف کی نفی پر مبنی کالے قوانین کا اسلحہ خانہ مقفل کر دیا جانا چاہئے نیز آپ لوگوں کی حس شرافت کو اس حد تک زندہ ہو جانا چاہیے کہ کسی دوسرے انسان، مسلمان اور پاکستانی شہری پر آپ غداری جیسا سنگین الزام زبان پر لاتے ہوتے ہزار بار سوچیں کہ کیا یہ آخری بات آپ کو ہونٹوں پر لے آنی چاہیے۔ آپ کو محسوس کرنا چاہیے کہ ہر انسان اور ہر مسلمان اور ہر پاکستانی کی عزت و حرمت بڑی قیمتی متاع ہے جس کے آپ ٹرسٹی بنائے گئے ہیں۔

لوگوں پر اگر آپ اعتماد کریں گے اور ان کے خلوص کا اعتراف کریں گے تو جواب میں آپ کے لیے بھی ایسے ہی احساسات پیدا ہوں گے۔ نیز اس رویے سے عوام کے اندر قوت عمل ابھرے گی، ان میں ذمہ دارانہ پن پیدا ہوگا اور ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے بجائے وہ اخوت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس کے نتیجے میں تعاون پیدا ہوگا۔ اور یہ چیزیں ایک تعمیری دور کے لیے بنیادی ضروریات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہ تین تبدیلیاں ایسی ہیں کہ اسلامی دستور کا پروانہ ہاتھ میں لے کر نکلتے وقت ارباب اقتدار کو انہیں اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ یہ درحقیقت کم سے کم ضروریات ہیں ایک دور نو کی علمبرداری کے لیے۔ ان تینوں ضروریات کو شریعت، عقل اور سیاست، تینوں کے نقطہ نظر سے پوری اہمیت حاصل ہے۔

بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں اکثر یہی ہوا ہے کہ اس قسم کے اہم تاریخی مواقع پر وقت کے حکمرانوں کو اپنا طرز عمل بدلنے کی توفیق نہیں ہوئی اور ان کی کوتاہی کی وجہ سے حالات غلط راستے پر پڑ جاتے رہے۔ اس طرح کی کوتاہیوں کے نتائج بعد میں نہ صرف حکمرانوں نے بھگتے بلکہ پوری ملت ستاہا سال ان کے

چکر میں پڑی رہی لیکن دوسری طرف ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں — چاہے تھوڑی ہوں — کہ کسی حکمران نے اپنے پارٹ اور کردار میں تبدیلی کر کے بہترین فضا پیدا کر دی۔ ہم خیرخواہانہ جذبے سے چاہتے ہیں کہ پاکستان کے حکمران ایک تاریخی موڑ پر پہنچ کر اپنی دوسری قسم کی مثالوں کی تقلید کریں اور عمل کی زبان سے پوری قوم کو تعمیری تبدیلیوں کا درس دیں۔

لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہُوا تو نہ صرف زیرِ تدوین دستور کے اپنے مقاصد میں ناکام رہ جانے کا اندیشہ ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ بہ حیثیت مجموعی پوری قیادت کے بارے میں جو مایوسی پیچھے سے چلی آرہی ہے وہ آہستہ آہستہ اپنی آخری حد کو جا پہنچے گی۔ لوگ موجودہ صورتِ حالات سے نکلنے کے لیے مضطرب ہیں اور نئے دستور سے دھندلی سی آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کو اخلاق و معیشت کے موجودہ فساد سے نکال لے گا۔ لیکن اگر ان کی یہ دھندلی سی آس بھی ٹوٹ گئی تو پھر کوئی لیڈر اور سربراہ کار ان کی ہمدردیوں اور ان کے اعتماد کو جذب نہ کر سکے گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر عوامی اعتماد کے کسی قیادت کو قرار اور استقلال نہیں مل سکتا۔ خود پاکستان ہی میں آپ اپنے پیشروؤں کا حشر دیکھ چکے ہیں کہ سال دو سال سے زیادہ کسی کو ٹکنا نصیب نہ ہُوا۔ عہدوں کی کرسیوں کی حفاظت کے لیے آہنی تلواروں اور استبدادی قانونوں کے کتنے ہی حصار استوار کر لیے جائیں لیکن اگر رائے عام مطمئن نہ ہو تو لوگوں کی بے اطمینانی دیمک بن کر مسندوں کے پایوں کو اندر ہی اندر چاٹ جاتی ہے اور مسند نشین اچانک دھڑام سے نیچے آرہتے ہیں۔ جبر کی حکومت ہمیشہ بودی ہوتی ہے، صرف محبتِ انسانیت کی حکومت دیرپا ثابت ہوتی ہے۔ یہاں قوت کا استعمال خطرناک کمزوری کی علامت ہے، صرف دلیل ایک قابلِ اعتماد قوت ہے۔

سوچیے کہ اس جمہوری دور میں اگر لیڈر قوم کے نظریات و مقاصد کے مطابق اپنے آپ کو نہیں بدلتے تو زمانہ ایسے متجبر لیڈروں کو راستے سے ہٹا کر آگے نکل جاتا ہے۔

ہم نے یہ سطور نہ عیب چینی کے جذبے سے لکھی ہیں، نہ کوئی چیلنج دینے کے لیے۔ بلکہ سچے خیرخواہانہ جذبات کے ساتھ اسلام کے تقاضوں، تاریخ کے اصولوں اور ملک کی ضروریات کو سامنے

رنگ کر اپنے سربراہ کاروں کو بہترین مشورہ ہم پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اسی اسپرٹ کے ساتھ ان سطور پہ غور کیا جائے!

خـــالی صفحـــه

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور میں چھپا